دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی

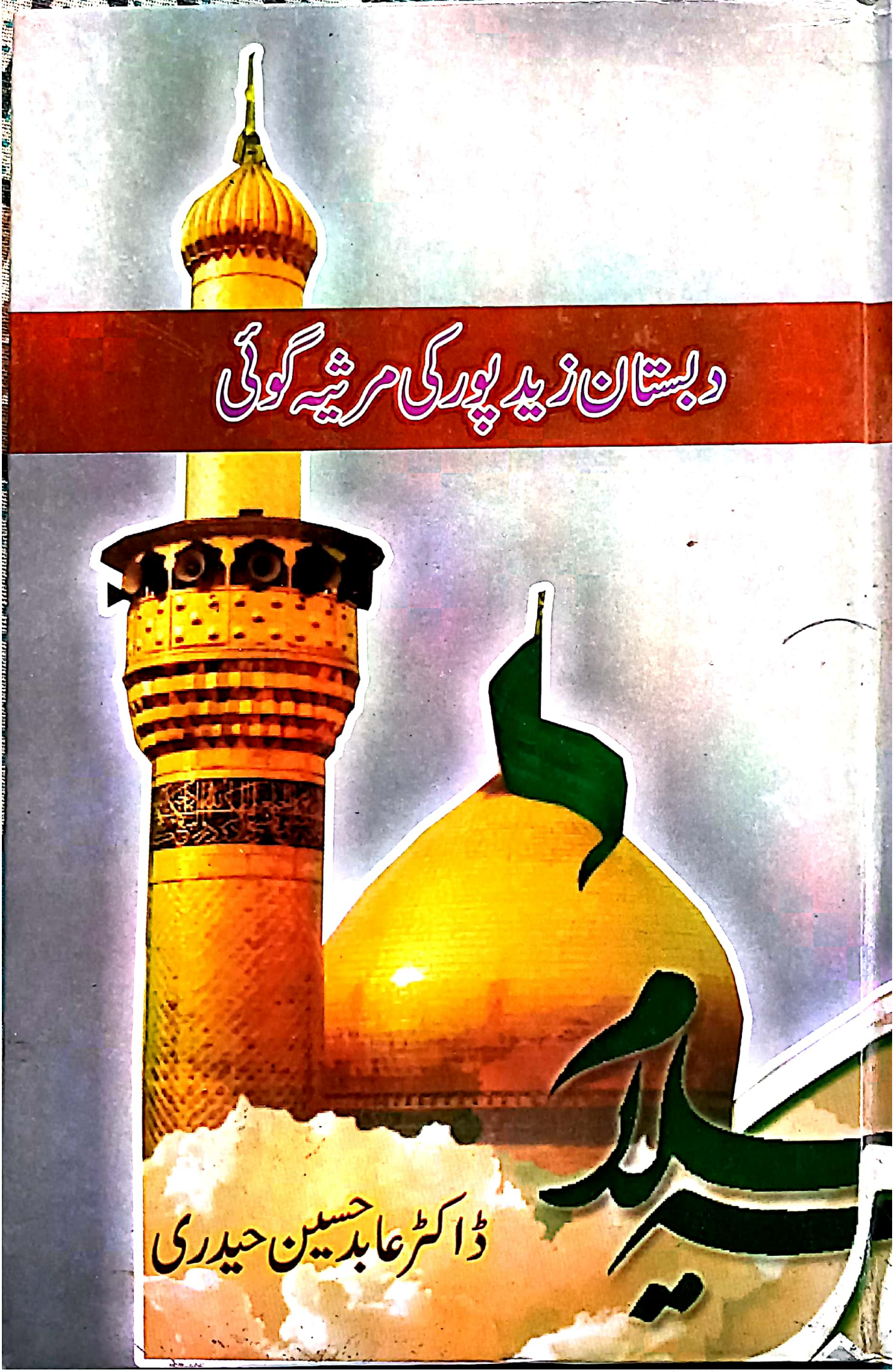

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

Scanned with CamScanner

دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

Scanned with CamScanner

انتساب

برادر معظم جناب محبوب علی مرحوم (رئیس کوپا گنج)

(متوفی ۲۳ ذی القعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

کے نام

جن کی دعاؤں کی بدولت میں اپنے خوابوں کی
تکمیل کے مرحلے تک پہنچا

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

DABISTAN-E-ZAIDPUR KI MARSIYA GOI
by
DR. ABID HUSAIN HAIDARI
Add: ALIYA MENTION, ABBASI TOLA, KOT (W)
Sambhal, 244302 (U.P.) INDIA
Mob: 9411097150
E:mail-drabidhusain@gmail.com

Year of Ist Edition:2014
ISBN: 978-93-84270-04-9
Price Rs:225/-

نام کتاب	:	دبستان زیدپور کی مرثیہ گوئی
مصنف وناشر	:	ڈاکٹر عابد حسین حیدری
سنہ اشاعت اوّل	:	2014
تعداد	:	400
صفحات	:	224
طبع	:	ایچ۔ایس۔آفسیٹ۔پرنٹرس، دہلی۔
کمپوزنگ	:	(اعظم علی) پی کمپیوٹر گرافکس شنکر کالج سنبھل
قیمت	:	۲۲۵ روپے (225=00)
پیشکش	:	ایلیا پبلی کیشنز، عباسی ٹولہ کوٹ غربی سنبھل۔یوپی

تقسیم کار:
SANDESH PARKASHAN
1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
E-mail:kitabiduniya@gmail.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

☆ پیش لفظ	ڈاکٹر عظیم امروہوی	۹
☆ تاریخ تالیف دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی	م۔ر۔عابد	۱۰
☆ پیش گفتار	ڈاکٹر عابد حسین حیدری	۱۱
☆ زید پور: آئینۂ ایام میں		۱۳
☆ دینی تحریکیں اور طرار زید پوری		۲۷
☆ میر انیسؔ اور زید پور		۳۲
فضلِ علی وقارؔ		۳۵
الہام حسین الہامؔ وبدرؔ		۴۰
فرزند حسن اثرؔ		۴۸
آغا علی زارؔ		۴۹
شبیر حسن وفاؔ		۵۶
مرتضیٰ حسین جوشؔ		۵۹
☆ زید پور اور دبیرؔ		۶۱
محمد علی زائرؔ		۶۱
مونس حسین مصیبؔ		۶۹
برکات احمد نجمؔ		۷۲
مفید حسن مفیدؔ		۷۶
سعادت حسین سعیدؔ		۷۸

Scanned with CamScanner

فراست حسین فراستؔ	۷۹
یونس حسین یونسؔ	۹۷
مبشر حسین سخنورؔ	۱۰۷
مفوض حسین نصیریؔ	۱۱۳
متوسط حسین اکملؔ	۱۱۵
ابنِ حسن، حسنؔ	۱۱۷
نفاست حسین نفاستؔ	۱۲۰
فائز حسین فائزؔ	۱۳۱
محمد حارج، حارجؔ	۱۳۷
مختصر حسین مختصرؔ	۱۴۰
غلام عباس ناصرؔ	۱۴۴
مودت مہدی مودتؔ	۱۵۰
محمد ضامر، ضامرؔ	۱۵۲
کنیز فاطمہ، فاطمہؔ	۱۵۴
محمد محسن، محسنؔ	۱۵۵
محمد باقر، باقرؔ جوراسی	۱۷۸
معصومہ خاتون، خاتونؔ	۱۸۴
محمد وفی، وفیؔ	۲۰۰
یاد حسن، یادؔ	۲۰۴
شہزاد حسین، شہزادؔ	۲۰۸
☆ حواشی واستدراک	۲۱۱
☆ مختصر سوانحی خاکہ	۲۱۵

پیش لفظ

رثائی ادب میں سانحۂ کربلا کو ایک اہم ترین اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لئے اس سے متعلق ادبِ اردو جیسی کم عمر زبان میں بھی اتنا تخلیق ہوا ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی المیہ رہا کہ المیۂ کربلا کے بیان پر مشتمل ادب جتنا تخلیق ہوا اس کا بہت بڑا حصہ منظرِ عام پر نہیں آ سکا۔ اسی لئے کافی سرمایہ وقت کے ہاتھوں تلف بھی ہو گیا۔ قابلِ قدر ہیں وہ محققین جنہوں نے اس جانب توجہ کی اور گم شدہ یا وقت کی گرد میں دبا ہوا ایسا ادبی سرمایہ جو نگاہوں سے اوجھل تھا اسے منظرِ عام پر لائے۔ حالانکہ یہ کام سنگلاخ وادیوں سے گذر کر جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

زید پور کی ایک تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ بستی اپنا مقام رکھتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے مسلسل ایک لمبے عرصے محنت و مشقت سے تلاش و جستجو اور تحقیق کے بعد ایک دبستان مرثیہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اور ان زیادہ تر مرثیہ نگاروں کی ادبی زندگی کے ساتھ کارِ مسیحائی انجام دیا ہے۔ اس میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں کے سلسلے سے وابستہ مرثیہ نگار بھی ہیں اور دیگر بھی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری کا یہ اقدام قابلِ تہنیت کام ہی نہیں بلکہ قابلِ تحسین کارنامہ بھی ہے اور ناقابلِ فراموش ادبی خدمت بھی۔

۷ر جون ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر عظیم امروہوی

دربار شاہ ولایت امروہہ

Scanned with CamScanner

تاریخ تالیف 'دبستانِ زید پور کی مرثیہ گوئی' مؤلفہ ڈاکٹر عابد حسین حیدری

(صدر شعبۂ اردو ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل)

حسبِ فرمائش محمد مفید و کمیل عابد حیدری سلمہما پسرانِ مؤلف

عابد حسین حیدری عالی وقار ہیں
اردو کے صدر شعبہ ہیں سنبھل قرار ہیں
ہیں ڈاکٹر ادب کے معارف نگار ہیں
تحقیق و نقد مرثیہ سے نامدار ہیں
ان کی نئی کتاب بھی ہے نذر مرثیہ
ہے وقف زید پور بھی اور قدر مرثیہ

وہ زید پور علم و ادب کا جزیرہ ہے
مدح و رثا ہی جس کے تخیل کا خاصا ہے
ذاکر بلالؔ و چودھریؔ سے جس کا چرچا ہے
اب حیدریؔ نگاہ نے جس کو ابھارا ہے
اس کے اثر کی بات ہے یا وقت کا ظہور
معروف اب ہے مرثیہ گوئی زید پور

۱۳۳۴ھ

رشحاتِ قلم: م۔ر۔عابد

(سابق جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا مقیم مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ)

پیش گفتار

۱۹۹۸ء کی بات ہے زید پور کی نامور سیاسی شخصیت اور محسنؔ زید پوری مرحوم کے نواسے جناب نہال رضوی (سابق چیئرمین فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش) نے راقم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے نانا محسنؔ زید پوری مرحوم کے مراثی شائع کرانا چاہتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ اسے ترتیب دے دیں۔ ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے راقم السطور نے جہاں ان مراثی کا از سرِ نو مطالعہ کیا وہیں زید پور سے متعلق مواد کی تلاش شروع کی اور ایک مبسوط مقدمہ سپردِ قلم کیا۔ زید پور کے تعلق سے مرحوم چودھری سید سبط محمد نقوی اور برادر محترم سید محمد رضا عابد (سابق جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا) اور مولانا سید محمد رضا ساجدؔ زید پوری نے مصادر کی نشاندہی کی۔ چودھری سید سبط محمد نقوی مرحوم نے شہکارِ فراستؔ اور محسنؔ زید پوری پر اپنا لکھا ہوا مضمون عنایت کیا۔ اس کے علاوہ مولانا سید محمد رضا زید پوری (امام جمعہ بارہ بنکی) ڈاکٹر سید محمد حیدر زید پوری اور برادر عزیز سید محمد منیف سلمہٗ نے بھی بہت سی قلمی بیاضوں اور نسخوں کے مطالعہ میں مدد فرمائی۔ یہ تفصیلی مقدمہ 'ارمغانِ محسنؔ' مجموعۂ مراثی محسنؔ زید پوری میں شائع ہوا۔ بہت سے بزرگوں اور اہلِ علم حضرات نے میری ہمت افزائی کی کہ یہ مقدمہ بہت معلوماتی ہے اور خاص طور پر چودھری سید سبط محمد نقوی مرحوم نے کہا کہ آپ اسے کتابی شکل دے سکتے ہیں۔ راقم اسی وقت سے تلاش و جستجو میں رہا اور جہاں بھی زید پور کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے جو کچھ بھی ملا اسے جمع کرتا رہا۔

مجھے خوشی ہے کہ یہ محنت رائیگاں نہیں گئی اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے صدقے میں آج لگ بھگ چودہ سال بعد چودھری صاحب مرحوم کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کتاب میں لگ بھگ تیس سے زائد مرثیہ نگاروں کے حالات اور ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی

Scanned with CamScanner

سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کئی مرثیہ نگار شعراء حیات ہیں جنھیں اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر رہا ہوں کہ اس کتاب میں زید پور کے تمام مرثیہ نگار شعرا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے یقیناً بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے یا جن تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ کتاب کی بعض کوتاہیوں سے خود بھی واقف ہوں لیکن آج کی بات کل پر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ فرائضِ منصبی اور مکروہاتِ زمانہ سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ابھی بستوں اور بیاضوں پر مزید دیدہ ریزی کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں خاتونِ زید پوری کا ایک مرثیہ اس لئے شامل کر دیا گیا ہے کہ کہیں یہ بھی ضائع نہ ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ نظر جہاں بھی میری کم علمی اور کوتاہ نظری کا سراغ لگائیں گے وہاں اس پر بھی نظر رکھیں گے کہ میں نے اردو مرثیہ کے ایک گمنام موضوع پر تقریباً چودہ برس کی خاموش جگر کاری کے بعد تاریخ مرثیہ کی ایک گمشدہ کڑی ڈھونڈ نکالی ہے۔ میری یہ کوشش اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے خشتِ اوّل کا کام کرے گی۔ ساتھ ہی مرثیہ کے محققین و ناقدین سے التماس ہے کہ اس موضوع پر بھی توجہ فرمائیں گے تاکہ وہ قصباتی شعرا جو گمنام ہیں ان کے فن پر بھی خاطر خواہ کام ہو جائے۔ آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں کسی نہ کسی مرحلہ پر میری مدد فرمائی خاص طور سے اپنی اہلیہ شہزادی بیگم اور اپنے بچوں زینت، مفید، کمیل اور ایلیا سلمہم کا جنھوں نے گھر کے ماحول کو ایسا خوش گوار بنا رکھا ہے کہ یہ سطریں ترتیب پا سکیں۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اور مرثیہ کے محقق ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کتاب کی ترتیب پر چند سطریں تحریر کی ہیں۔ برادر محترم سید محمد رضا عابد صاحب نے کتاب کی تکمیل پر مبارکباد کے خط کے ساتھ منظوم ہمت افزائی کی ہے جسے کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ پروردگار عالم بطفیل آلِ طٰہٰ ان بزرگوں کا شفیق سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھے۔

۱۰/ اگست ۲۰۱۴ء

خادمِ درِ آلِ نبیؐ

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

صدر شعبۂ اردو

ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل

زید پور: آئینۂ ایام میں

لکھنؤ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر پورب بارہ بنکی ضلع کا ادب نواز اور علم دوست قصبہ زید پور جس کے لئے دبستان زید پور کے ایک شاعر مودت زید پوری نے کہا:

لکھنؤ کی مرکزیت ہم کو بھی تسلیم ہے — ہے مگر کچھ اور ہی طرز فغان زید پور
آب کوثر سے وہ طاہر اور یہ تسنیم سے — وہ زبان لکھنؤ ہے یہ زبانِ زید پور

ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان کے بہت سے مقامات کی طرح زید پور بھی وہ جگہ ہے جسے مرثیے کے ایک بڑے پلیٹ فارم کی حیثیت دی جا سکتی ہے'' [۱]

مفتی محمد عباس مرحوم نے زید پور کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

چو در لکھنؤ شد فسا د و فتور — اقامت گزیدیم در زید پور
در انجا است پانصد نفر پور زید — نہ مانند بوزید پر مکر و شید
کہ اہل نیاز اند و مہماں نواز — ہمہ پاک دین و ہمہ پاکباز
ولیکن من از گردش آسماں — دراں سرزمیں ہم ندیدم اماں [۲]

یہ اشعار مفتی صاحب مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) میں قیام زید پور کے دوران کہے تھے۔ سید سبط محمد نقوی نے لکھا ہے کہ ''حضرات زید پور اس پر جتنا فخر کریں کم ہے کہ انہوں نے ایسے علامۂ اجل کی مہماں نوازی کی اور ان کے قلم حقیقت رقم سے نہ صرف ''نیاز مندی و مہماں نوازی'' بلکہ ''پاک دینی و پاکبازی'' کی بھی سند پائی۔ یہ سند ایک دو کے لیے نہیں جناب مفتی صاحب نے ''ہمہ'' کی وسعت میں ان کا احاطہ کیا ہے'' [۳]

Scanned with CamScanner

استاذی پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی نے لکھا ہے کہ ''لکھنؤ کی جس شعری اور علمی وراثت پر ہم فخر کرتے ہیں اگر اس کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ اس کا بڑا سرچشمہ اطراف و جوانب کے وہ قصبات ہیں جنہوں نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں اہم کارنامے انجام دیے۔'' ۴ ان قصبات میں زید پور کو یہ خصوصیت ہے کہ اس نے لکھنؤ کی اصل نمائندگی ہی نہیں کی بلکہ ایرانی اثرات اور مذہبیت جو لکھنوی ثقافت کے سب سے مؤثر عنصر ہیں ان کی بھرپور نمائندگی کی۔

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول جب کہ دبستان لکھنؤ میں شعر و سخن کا عام چرچا تھا جس کی عکاسی پروفیسر احتشام حسین نے یوں کی ہے:

> ''لکھنؤ بن سنور کر عروس البلاد کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اسکے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی، علم دوست اور رعایا پرور حاکم، سخی اور سخن سنج امرا، صاحب علم و تدبیر وزراء اور عمال حکومت، دہلی سے آئے ہوئے شعرا، فنکار، ماہرین موسیقی..... لکھنؤ پر ٹوٹ کر بہار آئی اور کل سو سال کے عرصے میں تہذیبی زندگی نے ایسے بال و پر پیدا کئے کہ دہلی تو دہلی شیراز و اصفہان کی رونق اس کے سامنے ماند پڑ گئی'' ۵

زید پور لکھنؤ سے دور نہ تھا لکھنؤ کے اس ماحول اور ادبی فضا سے اس بستی نے بھی کسب فیض کیا جس کے نتیجے میں یہاں سے اہل دل کارواں در کارواں جاتے تھے اور نقد دل کے عوض اس جنس نایاب کے خریدار بن کر عاشقان دل باختہ کے محشر میں شامل ہو جاتے تھے۔

زید پور ایک قدیم بستی ہے یہاں پر نہ صرف یہ کہ انیسویں اور بیسویں صدی ہی میں علما، ادبا اور شعرا نظر آتے ہیں بلکہ بستی کے وجود ہی سے علما، ادبا، صلحا، حکماء اور شعرا کا ایک طویل سلسلہ ہے بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ''زید پور ہمیشہ سے مرکز علم و ادب رہا ہے'' ۶ یہ بستی جن بزرگ حضرت زید (۴۶۲ھ - ۱۶ ربیع الثانی ۵۲۶ھ مطابق ۱۰۷۰-۱۱۳۲ء - جنوری) کے نام نامی سے آباد ہوئی ان کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ

مبرقع فرزند امام محمد تقی کے واسطے سے امام علی رضا تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد عبد اللہ زربخش تھے جو اپنے دادا سید احمد ابو عبد اللہ نقیب القم (۳۱۱ھ - ۳۵۸ھ مطابق ۹۲۴ء - ۹۶۹ء) کے مستقر قم سے جاجرم آ بسے تھے پھر لاہور ہوتے ہوئے یہاں وارد ہوئے اور سلطان محمود غزنوی کے بہنوئی سالار داؤد کی بیٹی اور سالار مسعود غازی کی بہن سے شادی کی جن کے بطن سے زید کی ولادت ہوئی اور زید پور کی آبادی اور زید کے بڑے ہونے پر خود جاجرم واپس چلے گئے جہاں ۴۹۳ھ/ ۱۱۰۰-۱۰۹۹ء میں انتقال کیا۔ زید یہیں رہے اور اسی وقت سے زید پور آباد ہوا۔ ع۔ بست و دوبار نام زید بخواں ۷ جس سے ۴۶۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ تاریخ ہے ۸ زید نے اپنی پوری زندگی عبادت و ریاضت میں گزاری۔ کشف و کرامت دونوں باپ بیٹوں سے منسوب ہے۔ زید کی اولاد زید پور میں بڑھی اور وہاں سے وقتاً فوقتاً دوسرے مقامات پر آباد ہوتی رہی، سیتاپور، کراری (الہ آباد) امروہہ اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں میں سادات زید پور کی بڑی شاخیں آباد ہیں۔

جہاں تک زید پور کی علمی و ادبی روایت کا تعلق ہے اس مومن خیز بستی نے علما، افاضل، شعراء و مداحان اہلبیت کی بڑی تعداد پیدا کی۔ بقول سید سبط محمد نقوی ''بلا خوف تردید عرض کیا جا سکتا ہے کہ رؤساء، علما اور مداحان اہلبیت کی ایسی مسلسل روایت کسی دوسری بستی نے کم ہی پیش کی ہوگی'' ۹ اٹھارہویں صدی میں یا اس کے پہلے کے علما و شعرا میں فروغ سیتاپوری کے نسب نامے میں صرف چند نام ملتے ہیں جن میں عبد الاول شارح بخاری، اکبر علی عشقی، برکت علی، مولوی رحم علی، محمد رضی، سید احمد بن حکیم وجیہ الدین اور حافظ و قاری امام بخش وغیرہ۔ یہ سب کے سب فارسی و عربی کے عالم و ادیب اور باکمال شاعر تھے۔ لیکن دنیائے ادب کی نظروں سے اوجھل رہے، ہاں تذکروں میں ایک نام سید جلال الدین غالب کا ملتا ہے جو بنارس کے درویش عالم جناب شیخ علی حزیں کے معاصر تھے جن کا یہ شعر زباں زد خلائق ہے:

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا ہر برہمن پسر لچھمن و رام است ایں جا

Scanned with CamScanner

غالبؔ کی علمیت کا شہرہ سن کر شیخ علی حزیںؔ نے ان سے ملاقات کی خواہش کی اور انہوں نے غالبؔ کو اپنے یہاں دسترخوان پر مدعو کیا۔ اس واقعہ کا تفصیلی ذکر مفتی محمد عباس مرحوم نے 'درمنثور در حالات زید پور' میں کیا ہے۔

اس جلیل القدر شاعر کے والد سید حسین تھے جو فن کشتی کے ماہر اور شجاع و بہادر تھے۔ بڑے بھائی حکیم وجیہ الدین حسین علامۂ دہر اور طبیب حاذق تھے۔ غالبؔ ۱۱۲۳ھ کے قریب پیدا ہوئے بڑے ہی خوش خو، خوش خلق، لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے۔ شجاع الدولہ (بعہد ۱۱۷۰ھ۔ ۱۱۸۸ھ) کی ملازمت و مصاحبت میں صاحب عز و امتیاز رہے۔ اکثر حکومت محالات، چکلہ داری اور فوجداری پر مامور رہے میر حسین دوست سنبھلی نے ''تذکرۂ حسینی'' میں انہیں لکھنؤ کا عامل لکھا ہے:

''شاعر مکاسب میر جلال الدین غالبؔ زید پور کے سادات سے ہیں، جو لکھنؤ کے عامل تھے۔ یہ شعر انہیں کا ہے'':

بہ بزم تست زصہبائے ناب در مینا پری زشرم رخت گشتہ آب در مینا[10]

مولوی عبدالوہاب افتخارؔ نے تذکرۂ بے نظیر[11] میں میر جلال الدین غالب کو 'عالمِ طب، لطیفہ گو، بذلہ سنج' کے الفاظ سے نوازا ہے۔

علوم عربیہ میں معاصرین میں ممتاز تھے۔ تمام عمر عبادت و اطاعت اور درس و تدریس اور فکر نظم میں بسر کی۔ فارسی کے مستند شاعر ہی نہیں کثیر التصانیف تھے ان کا فارسی دیوان آٹھ، بیس یا پینسٹھ ہزار اشعار پر مشتمل غیر مطبوعہ رہا لیکن ان کی ایک مثنوی ''گلدستۂ معانی'' (درحال حضرت جنت) سنہ تصنیف ۱۱۶۰ھ اشاعت ۱۲ پذیر ہوئی۔ مفتی محمد عباس مرحوم نے 'درمنثور در حالاتِ زید پور' میں غالبؔ زید پوری کی فارسی دانی کا اعتراف کیا ہے:

''از سادات قصبۂ زید پور سید جلال الدین غالبؔ کے اور ابرا مثال و اقرانش در جلالت شان غالب تواں گفت۔ مردِ دیندار و شاعر نغز گفتار بودہ۔ در ہر دو صفت گوئے سبقت ربودہ۔۔۔۔۔ و اما شعر و سخن دریں

جز و زمان کسے از متبعان بادنمی رسد و کلامش با کلام اہلِ زبان خیلے مشابہت دارد۔''[13]

۱۵ر شوال ۱۱۸۳ھ میں ۶۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ''گلدستۂ معانی'' کے مقدمہ میں مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی وفات کا سنہ ۱۱۸۳ھ ظاہر ہوتا ہے جبکہ ''شجرات طیبات'' میں ۱۲۶۰ھ درج ہے جو سہو کتابت معلوم ہوتا ہے اشعار درج ذیل ہیں:

وفاتش را چو من کردم خیالے کہ از ہجرت گذشتہ چند سالے

بتاریخ کہ او رحلت بفرمود ہزار و یکصد و ہشتاد و سہ بود

'گلدستۂ معانی' کا ایک مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ یہ نسخہ بہ اہتمام سید عابد علی مطبع اثنا عشری لکھنؤ سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس نسخے میں منظوم مقدمہ سید الہام حسین الہامؔ کا موجود ہے۔ جس میں غالبؔ کے تعلق سے کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔ مذکورہ مقدمہ میں حمد و نعت کے علاوہ منقبت حضرت امیر المومنین علیہ السلام موجود ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے تعلق سے الہامؔ رقم طراز ہیں:

تعالی اللہ عجب زیبا کتابے کہ ہر بابش بود از خلد بابے

کنم اوصاف ابیاتش چہ مسطور بود از بیت آں بس بیت معمور

بوصف آں دگر گویم چہ مضمون چو بیت ابروئے دلدار موزوں

مصار یعش برنگ تیر مژگاں نشستہ در دلِ عشاق پنہاں

حروفش نافۂ مشک غزالاں معانی چوں دل نازک خیالاں۔۔۔۔

سطورش جادۂ گلزار فردوس شمارش کہکشاں طوبیٰ قدمبوس

اور آگے غالبؔ کے اشعار کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان کے اشعار کے مضامین کو 'ہمہ شائستہ و شستہ' قرار دیا ہے:

نہ بینی ہیچ شعرش حشو بے آب

ہمہ چوں نخل گل رنگین و شاداب

Scanned with CamScanner

الہام کے مطابق درج بالا اوصاف کا شاعر ملنا محال ہے:

بروں اوصاف آں از قیل وقال است
مثالش گر کسے آرد محال است

اس کے بعد مصنف نے غالب کی مدح میں انتیس اشعار کہے ہیں۔ جس میں غالب کی شاعری اوران کی علمی وادبی حیثیت کا محاکمہ کیا ہے۔ الہام نے درج ذیل اشعار میں غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے:

بملک نظم غالب بادشاہ است — علم کلک مضامینش سپاہ است
بگنج علم دیں او بود عامل — سخن گو عالم تحریر کامل
سخن زد گشت در عالم ہویدا — سخن از بہر او گردید پیدا
سخن را داد رونق از مطالب — سخندان جہاں مغلوب غالب

الہام نے غالب کو منقولات ومعقولات کا عالم متبحر اور انہیں اپنے عہد کا حسان و سحبان قرار دیا ہے اور اس کے بعد ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بہ بیں در شعر گوئی عزم اورا — بدید طولی بود در نظم اورا
چو در نظم سخن آہنگ سازد — بنظمش بلبل فردوس نازد
بخواندی گر نظامی نظم دیرا — ہمی گفتی جزاک اللہ خیرا
بگوید در ثنایش روح سعدی — ہمہ ہیچ اندالا انت بعدی
اگر خسرو بدیدی مثنوی را — بیفگندی کلاہ خسروی را
نہادی سر بہ پیش از عجز جامی — نوشتی از خطا خط غلامی
عجب نظمیست با آب وصفائی — ثنائے مثنوی گوید سنائی ۔۔۔۔۔

نہ بیند کس چو نظمش در زمانہ
بفن شاعری باشد یگانہ

سید الہام حسین الہام 'گلدستۂ معانی' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''گلدستۂ معانی کہ محتوی است بر حال امام ہادی عشر وقصہ
خریدن جس خاتون والدۂ ماجدہ جناب صاحب العصر فرمان فرمائی قضاو
قدر نائب مناب حضرت خیر البشر امین الدیان خلیفۃ الرحمٰن امام الانس
والجان۔ اللّٰہم عجل فرجہ وسہل مخرجہ۔''

(مقدمہ گلدستۂ معانی: الہام حسین الہام: ص ۴)

درج بالا عبارت سے جہاں گلدستۂ معانی کے موضوع کا علم ہوتا ہے وہیں الہام کی فارسی نثر کی مہارت کا بھی عرفان ہوتا ہے۔ گلدستۂ معانی میں غالب نے حمد ونعت کے روایتی طریقے کو اپناتے ہوئے ائمہ اثنا عشر کی منقبت بیان کی ہے۔ غالب محبوب خدا خیر البشر کا تعارف بڑے خوبصورت انداز میں کراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشعار کی روانی اور خوبصورت پیش کش میں حضور کی شخصیت وسیرت مزید ابھر کر سامنے آتی ہے:

در آخر عہد ختم مرسلیں شد — نبائے دین حق ازوے متیں شد
از و دین خدا گردید کامل — بحال خلق رحمت گشت شامل
بعہدش محو شد کفر وضلالت — بر و گردید ختم امر رسالت
بود بر فرق او تاج کرامت — کہ دین اوست قائم تا قیامت

اور اس کے بعد غالب نے اپنے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے حضور پرنور کے صفات کی مزید نشاندہی کی ہے:

محمدؐ باعث ایجاد افلاک — تواں فہمید ایں معنیٰ زلولاک
وجودش علت فانی کونین — زمین وآسماں وانور وزین
فلک از درگہہ او آستانے — زمیں از پا بہوش آسمانے
بود نور خدا ذات شریفش — ازاں بے سایہ شد جسم لطیفش

نعت رسول مقبول کے بعد غالب مولائے متقیان کے حضور درج ذیل انداز میں سر نیاز خم کرتے ہیں:

Scanned with CamScanner

خدا را مظہر نور و صفا اوست — وصی و جانشین مصطفیٰ اوست
سرشت شاں زیک نوراست دراصل — سر موئے نباشد درمیاں فصل
بہم نسبت بغیر از جسم و جاں نیست — تفاوت جز نبوت درمیاں نیست

اس کے بعد غالب اپنے عقیدے اور عقیدت دونوں کو واضح کرتے ہیں:

غلام اوست ہر کس اہل دین است — کہ مولا یش امیر المومنین است
بود ایماں عبارت از ولا یش — عبادت نا روا بے اقتدا یش

غالب نے اس مثنوی میں حضرت نرجس خاتون والدۂ محترمہ حضرت صاحب العصر والزمان کے حالات تاریخی حوالے سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے تمہید مثنوی میں لکھا ہے کہ میں نے پہلے پہل لیلیٰ مجنوں کے قصہ کو مثنوی کا روپ دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے کو تمام نامی گرامی شعراء نے نظم کیا ہے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ حضرت نرجس خاتون کے حالات کو مثنوی کی شکل میں پیش کروں:

چہ حاصل گر کنم در نظم دیگر — کہ کم شیریں بود قند مکرر
بمن تا قصۂ نرجس رسیدہ — دل آوارہ گردید آرمیدہ
بنظمش چوں حدیث دلبر عشق است — بیان حسن و ذکر شور عشق است
بنظم آوردنش شد دل نشینم — کہ از روئے کتب آمد یقینم

غالب نے اس مثنوی کے تعلق سے اس کے موضوع کی وضاحت درج ذیل اشعار میں کی ہے:

مراد از گل گل باغ امامت — امام عسکری روشن کرامت
بود نرگس زنے والا نژادے — مبارک طینتی قسمت نہادے
تعالیٰ اللہ زہے مطلوب و طالب — خدائے نام ایں شاں جان غالب

غالب نے اس مثنوی کی تعریف خود بھی کی ہے لیکن انداز التجائی ہے:

چو ہر فے از گل و نرگس نوشتم — رسانید مد بوئے از بہشتم
بدست من نئے نرگس قلم شد — ورق چوں برگ گل رنگیں رقم شد
وگر از معنی رنگین و تازہ — تواں بستن بروئے صفحہ غازہ
مقرر کردہ ام گلدستہ نامش — برنگینی بکن یا رب تمامش

غالب نے خاتمہ میں اس مثنوی کی تکمیل ۱۱۸۰ھ بتائی ہے۔ اور یہ مثنوی ایک ہزار چھ سو انسٹھ اشعار پر مشتمل ہے انہوں نے خاتمہ میں لکھا ہے:

رسید از غیب تاریخ بدستم — کہ گلہا چیدہ ایں گلدستہ بستم (۱۱۸۰ھ)
بود ابیات از گلہا عبارت — برنگینی نمودم استعارت
چو بشمارند یک یک می شود کل — ہزار و شش صد و پنجاہ و نہ گل (۱۶۵۹)

سید محمد علی زائر زید پوری نے تین تاریخیں نظم کی ہیں۔ دو تاریخوں کے مادۂ تاریخ اور ایک مکمل تاریخ طبع ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

کرد زیب نظم زائر بہر سال طبع او — اے خوشا مدح امام قایم دیں پاکزاد

۱۳۰۲ھ

طبع زائر کرد بہر سال طبعش زیر نظم
مژدۂ عشرت فزائے طالبان پاک دیں

۱۳۰۲ھ

شد زیب طبع نیک از طبع زاد غالب — مجموعۂ فصاحت گلدستۂ معانی
در عرصۂ بلاغت از بوستان سعدی — بربود گوئی سبقت گلدستۂ معانی
از صاحب زمانہ باشایقان حق بیں — خوش میدہد بشارت گلدستۂ معانی
یارب بدست غالب از بہر آل طٰہٰ — باشد کلید جنت گلدستۂ معانی
زائر بسال طبعش گفت عندلیب طبعم — گل بانگ اہل جنت گلدستۂ معانی

۱۳۰۲ھ

Scanned with CamScanner

غالبؔ کے بعد حافظ الدولہ مہدی حسین، مفتی محمد ابن تفضّل حسین عرف چھنگا ابن محمد حنیف رضوی، مولانا غنی نقی اور سید مہدی حسین عبرتؔ وغیرہ نے ادب و شاعری کے علاوہ ریاست و امارت میں بھی نام پیدا کیا۔ حافظ الدولہ مولانا مہدی حسین (م ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ / فروری، مارچ ۱۸۷۰ء) سلطان العلما سید محمد رضوان مآبؔ کے شاگرد، مولانا غنی نقی کے ہم عصر اور بڑے ہی فاضل عالم دین تھے۔ اودھ کے تین بادشاہوں نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے استاد تھے۔ نصیر الدین حیدر کے دربار سے خطاب ملا تھا۔ ایک عرصہ تک تعلقۂ زید پور ان سے متعلق رہا۔ کئی یادگار کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے ترجمۂ ''صحیفہ کاملہ'' کو مرتضیٰ حسین فاضلؔ نے صحیفہ کا پہلا اردو ترجمہ قرار دیا ہے۔

مفتی سید محمد رضوی زید پوری اپنے عہد کے بڑے عالم و فاضل، متقی و زاہد، مقدس و عارف تھے۔ مرتضیٰ حسین فاضلؔ کے مطابق:

> ''جناب سید علی شاہ رضوی کشمیری اور جناب شریف العلماء شیخ مرتضیٰ انصاری سے اجازے رکھتے تھے۔ امجد علی شاہ اودھ کے زمانے میں سیتا پور (خیر آباد) کے مفتی تھے۔ غدر (۱۸۵۷ء) میں ان کے احوال ضائع ہو گئے۔''[۱۴]

مرزا محمد مہدی لکھنوی کے الفاظ میں:

> ''وی فاضل بود جلیل عالم بود، نبیل زاہد عابد تارک دنیا متورع مقدس خبیر بودہ۔۔۔۔۔ در عہدِ امجد علی شاہ پادشاہ مفتی خیر آباد بود۔''[۱۵]

سید مہدی حسین عبرتؔ ۱۲۰۶ھ۔ ۹ محرم ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۷۹۲ء۔ نومبر ۱۸۱۹ء جو محمد حسن رئیس (م ۱۲۴۰ھ) کے فرزند اور مرزا قتیلؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ خود باکمال شاعر تھے افسوس کہ صرف ۲۸ رسال کی عمر میں وفات پائی۔ بقول فروغؔ سیتا پوری ''وہ عجب صاحب علم و فضل ہوئے ..... ان کا کلام فارسی جس قدر موجود ہے قابل دید قابلین اور لائق ہزار آفرین و تحسین ہے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو عجب نہیں تھا کہ غالبؔ زید پوری سے

گوئے سبقت لے جاتے'۔ ۱۶ قطعۂ تاریخ کا مادہ ہے ''حقا کہ وحید عصر (۱۲۳۵ھ) عدیم المثال بود''۔ نامور مرثیہ گو فراست عبرتؔ کے نواسے ضامن حسین کے فرزند تھے۔

اس دور کی سب سے اہم شخصیت مولوی میر غنی نقی (۳ رجب ۱۱۲۰ھ۔ ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۵۷ھ مطابق ستمبر ۱۸۰۵ء۔ یکشنبہ یکم اگست ۱۸۴۱ء) ہیں جو جلیل القدر، مایہ ناز عالم، بلند پایہ محقق و مصنف اور صف اول کے فقیہہ و فاضل افراد میں شمار کیے جاتے تھے۔ سید العلما سید حسین عرف میرن صاحب کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ پایۂ علم و فضل میں تا حد اجتہاد فائز تھے۔ ۱۷ غازی الدین حیدر کے مقرر کردہ بورڈ کے رکن رکین اور تاج اللغات کی ترتیب پر مامور تھے۔ تصانیف میں 'فرق اللغات' اور دیگر کتب و حواشی شامل ہیں۔ ان کی فارسی و عربی نظم و نثر کے نمونے ''نجوم السماء''، ''ظل ممدود'' اور ''رطب العرب'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا محمد حسین نوگانوی نے 'تذکرۃ العلماء' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''آپ اکثر علوم خصوصاً فنونِ ادبیہ و درسیہ و معقولات و لغت عرب وغیرہ میں بہت تبحر رکھتے تھے اور صفائی وجودت وطبع میں اپنے امثال واقران پر فائق تھے۔ اور مباحث کلامیہ میں طرفِ مقابل کو ملزم کر کے چھوڑتے تھے۔ اور بڑے مقدس محتاط اور علم و حلم سے آراستہ اور صلاح و تقویٰ سے پیراستہ تھے۔ باوجود ان خصائل کے تہذیب اخلاق اور انکسار نفس میں بے مثل تھے۔''[۱۸]

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولوی میر غنی نقی صاحب زید پوری ایک زبردست ادیب و فاضل تھے۔ مفتی صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے اور زمرۂ احباب خاص تھے بلکہ غالباً ہمدرس بھی رہے تھے''۔[۱۹]

مفتی محمد عباس مرحوم نے ''آب زلال'' میں غنی سے اپنے روابط کا ذکر کیا ہے جس

Scanned with CamScanner

سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غنی آں راز دار و محرم من — انیس و ہم صفیر و ہمدم من
جلیس من بزم نکتہ دانی — ردیف من بوقت شعر خوانی
کہ لذت یاب می شد از کلامم — کلامش بود چوں شکر بکامم
بذوقش کردہ ام نظم فرائد — بشوقش گفتہ ام چندیں قصائد
بگوشش میرسانیدم درناب — بوصلش گفتمی فصلے زہر باب
گہے معنی زمن الفاظ ازوے — گہے چشم از من والحاظ ازوے
بسیر راہ دیں ہمراہ من بود — تصانیفش تماشا گاہ من بود
سحر گاہاں چو باد صبح گاہی — رسیدش یک بیک پیک الٰہی
چو شمع از انجمن ناگاہ برخاست — زمن چوں شمع دود آہ برخاست
تمام شب چو بلبل بود در جوش — سحر شد چوں چراغ صبح خاموش
بکنج خاک جا شد از برایش — بچشم پر صفا خالیست جایش
ازو دی بود با من ہمزبانی — من و امروز بے او نوحہ خوانی ۲۰

مفتی محمد عباس مرحوم نے اپنی ایک عربی نظم میں بھی مولوی غنی نقی سے جہاں اپنے روابط کا ذکر کیا ہے وہیں ان کی علمی حیثیت، اخلاق حمیدہ اور تقوی و پرہیز گاری کا تذکرہ کیا ہے:

ذاك الغنى عن المعائب والتقى — عن المعائب ، مانسيت محامده
نصبت عيون العلم عندو فاته — وجرت نصرفته عيون جامده
عجبا لتربته التى حلت بها — تقوى و علم ثم نفس ناقده
عجبا لمقلته التى عهدى بها — سهر الليالى كيف اصحت راقده
هذا بيان رحليه من عندنا — اما الفوات كماله فعلى حده
عام الوفاة له مراتب اذبح — سبع و خمس و اثنان واحده ۲۱

افسوس کہ یہ باکمال شاعر صرف ۳۷ سال کی عمر میں ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کر

گیا۔ لاش زید پور لائی گئی اور اپنے جدی قبرستان میں دفن ہوئے۔ پختہ مقبرہ بنا ہوا ہے۔ قطعۂ تاریخ سنگ مرمر پر کندہ تھا مادہ کا شعر درج ذیل ہے:

قلم سال تاریخ فوتش نوشت
شدہ حاوی علم سوئے بہشت (۱۲۵۷ھ)

غنی کے مفتی محمد عباس مرحوم سے انتہائی گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے۔ عربی نثر و نظم میں خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ان کے نام مفتی صاحب مرحوم کے چند خطوط ''ظل ممدود'' میں شامل ہیں ان کی ایک نظم 'تجلیات' میں دیکھی جا سکتی ہے جس پر قوسین میں مفتی صاحب کی اصلاح موجود ہے۔

مفتی صاحب مرحوم ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں جب زید پور گیے تو مولانا غنی نقی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد درج ذیل نظم لکھی۔ عزیز لکھنوی نے 'تجلیات'' میں لکھا ہے کہ مفتی صاحب کو غنی کی وفات کا بیحد صدمہ تھا۔ قیام زید پور کے زمانے میں اتفاقاً مولانا کی قبر کی طرف سے ایک روز گذر ہوا اور یہ اشعار نظم فرمائے:

بمرقد رسیدیم با ہم دگر — نشاندیم کل از دعائے سحر
دلم سوخت بر قبر آں قدرداں — ز دل سورۂ قدر خواندم برآں
بیاد آمد از صحبت پاک او — نشستیم تا دیر بر خاک او
کہ او خیر چوں آمدے پیش من — شدی شمع شاں رونق انجمن
بے از سر شام تا نیم شب — ز حرف و حکایت نمی بست لب
بتشویق من شوق اشعار کرد — باصلاح من در سخن کار کرد
درایں وادی آمد ز آورد من — تصانیف او ہم قلم خورد من
سفر کرد چوں در شباب از جہاں — ز جد و پدر داشت چندی نشاں
کنوں زد بجز استخوانے نماند — ز اصل و ز فرعش نشانے نماند
ہمیں است حال جہان خراب — فیاللد واہی و یاللمصاب ۲۲

غنی کے بعد حکیم سید مرتضیٰ محمد، حکیم سید کرم علی اور مولانا سید علی ضامن اس عہد کی اہم شخصیتیں ہیں۔ مولانا سید علی ضامن (۲۱ر صفر ۱۲۶۸ھ - ۱۰ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ مطابق دوشنبہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۵۱ء - دوشنبہ ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء) مشہور مرثیہ گو یونس کے خالو تھے۔ ان کے والد سید نذیر علی (۱۲۳۸ھ - ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء - ۱۸۹۱ء) مشہور زمانہ شہ سوار اور شجاع تھے۔ خود موصوف عربی و فارسی کے جید عالم ہندی، میواڑی اور دیگر بولیوں کے ماہر۔ فقہ میں کامل اور ماہر نساب تھے۔ ''شجرات طیبات'' کا وہ حصہ جو زید پور سے متعلق ہے انہیں کی ترتیب و تدوین سے مرتب کیا گیا۔ ریاست اودے پور میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں وطن آ رہے اور اپنے کو دینی و ملی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا۔ انجمن ناصر الایمان زید پور کے سکریٹری، مدرسۂ ایمانیہ زید پور کے متولی اور شیعہ کانفرنس کے سرگرم ممبر رہے۔

دینی تحریکیں اور طرارؔ زید پوری

زید پور ہمیشہ سے ادب و مذہب سے وابستہ رہا ہے یہاں دینداری کی بنیادیں اتنی گہری تھیں کہ یہاں دینی تحریکوں میں نہ صرف جان ڈالی گئی بلکہ اکثر رہنمائی بھی کی گئی۔ یہی نہیں کہ ائمہ معصومینؑ کی ولادت و شہادت کی تاریخیں بڑے اہتمام سے منائی جاتیں بلکہ ائمہ معصومینؑ کے علاوہ دیگر جلیل القدر ہستیوں مثلاً جناب خدیجہ، جناب زینب، فاطمہ کبریٰ، شہزادہ عبد العظیم وغیرہم کی وفات کی تاریخیں بھی زید پور میں شان غم و الم کے ساتھ منائی جاتی ہیں علاوہ ازیں واقعۂ کربلا کی تمہید یعنی مدینہ سے سفر امام مظلوم کی یادگار قائم کرنے میں قدامت کا شرف بھی اسی آبادی کو ہے اس سلسلے میں دو تاریخوں یعنی ۲۸ر رجب و ۴ر شعبان کو بڑی شان و شوکت سے سفر امام عالیمقام کا جلوس برآمد ہوتا ہے۔ ۱۳۶۱ھ میں جب یادگار حسینی کی تقریبات منعقد کی گئیں تو اہل زید پور نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یادگار حسینی کا ایک شاندار پروگرام مولانا حیدر مہدی اور جناب سردار مہدی کی کوششوں سے انجام پایا۔ ''ولادت و وفات معصومینؑ کی تاریخوں پر محافل و مجالس کے انعقاد کا سہرا بھی زید پور کے ایک فرزند.....زوار حسین طرارؔ کے سر ہے''۔[۲۳] زوار حسین طرارؔ صوبۂ بہار میں تحصیلدار کے معزز عہدے پر فائز تھے مگر اپنی آزاد منش اور سخن ساز افتاد طبع سے ملازمت کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ آ گئے۔[۲۴] طرارؔ بڑے ہی فاضل تھے۔ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ادیب و صحافی و مترجم اور شاعر کی حیثیت سے ان کا نام بلند ہے علاوہ ازیں وہ ایک مخلص

Scanned with CamScanner

اور دردمند قومی رہنما بھی تھے۔ انجمن صدر امامیہ کے بانی تھے۔ یہ انجمن غیر سیاسی تھی جس کے مقاصد خالص ادبی اور مذہبی تھے اس کے اراکین سے اصلاحی مضامین لکھوا کر رسالہ ''اودھ'' میں شائع کیے جاتے تھے دوسرا اور خاص مقصد اس انجمن کا یہ بھی تھا کہ حضرات معصومینؑ کے سلسلے میں محافل منعقد کی جائیں جس میں مشاہیر شعرا کو مصرع طرح دے کر ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ہر محفل میں طرح پر نئے قصائد پیش کریں۔ اسی انجمن صدر امامیہ کو بعد میں ''آل انڈیا شیعہ کانفرنس'' کا نام دے دیا گیا جو ایک عرصہ تک شیعوں کی سماجی (غیر سیاسی) اور نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے ممتاز رہی۔ وہ ''اودھ اخبار'' کے ادارتی عملہ سے وابستہ رہے پھر خود ہی ''اخبار المومنین'' اور ''گوہر شہوار'' نام سے اخبار و رسالہ جاری کیا۔ اس طرح طرار زید پوری نے اپنی پوری زندگی اردو ادب اور شعر و سخن کی بے لوث خدمت میں صرف کر دی آپ کا مطالعہ انگریزی ادب کا بہت وسیع تھا۔ معیاری مضامین لکھا کرتے تھے شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا ندرت، جذبات و احساسات، زبان میں سلاست آپ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ حامد علی خاں بیرسٹر نے ان کا کلام جمع کیا تھا لیکن طباعت کی نوبت نہ آئی۔ بہر حال طرار زید پوری نے لکھنؤ میں رہ کر تلامذۂ انیس کے دوش بدوش قصیدہ نگاری کو ایک نئی وسعت دی اور منقبتی قصائد کو عوامی بنا دیا اور اس طرح قصیدہ دربار سے نکل کر عوام کے بیچ آ گیا اور یہ بیش بہا صنف غلو سے نکل کر مدح خالص میں ڈھل گئی اور بقول عالم زید پوری ''دنیاداری سے باہر نکال کر دینداری کی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا''۔ ۲۵

طرار کے ایک نعتیہ قصیدہ کے مدح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جو اہل دل ہیں وہ بھرتے ہیں دم تیری محبت کا
کہ تیری ذات ہے دنیا میں معیار وفائے دل
تری الفت کا سودا کس قدر ارزاں ہے عالم میں
کجا وہ بے بہا شے اور کجا نقد بہائے دل
درود اپنے نبیؐ پر بھیجتا ہے دمبدم شاید
وگرنہ ہر نفس آتی کہاں سے یہ صدائے دل

اسی کے واسطے سب کچھ اسی کی ساری خاطر ہے
فدا ہے تجھ پہ میرا دل میں، میں جاؤں فدائے دل
مرے سینے میں بھی اک جشن مولود آج برپا ہے
درود پاک کے نعرے ہیں اور عشرت سرائے دل
جو باطن تھا وہ ظاہر تھا ترا اے نور یزدانی
بنایا ہے تجھے خالق نے خط استوائے دل
مدینہ ہو کہ مکہ وہ نشیمن ہے جہاں تو ہے
جدھر قبلہ اُدھر یہ طائر قبلہ نمائے دل
رہا دنیا میں تیرے بعد تیرے نفس کا جلوہ
کہ چھایا آج تک ہے وہ ترا ظل ہمائے دل
کجا وہ کفر کی کثرت کجا اسلام کی قلت
سپاہی کا کوئی سالار اتنا تو بڑھائے دل
بس اب میں پڑھ چکا اور قافیے میں ہو چکے سارے
رہا اک قافیہ طرار سو وہ ہے دعائے دل
قصیدہ میں ترے محبوب کے یہ کام آیا ہے
الٰہی تجھ سے جو مانگے وہی شئی آج پائے دل ۲۶

طرار نے راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر حسن خاں حبیب و سحر کے دیوان کے شائع ہونے پر ایک نظم نما قصیدہ کہا ہے جس کی ردیف اردو ہے اور آخر میں انہوں نے دیوان کی تاریخ بھی کہی ہے۔ یہاں پر یہ مکمل نظم پیش کی جا رہی ہے اس لیے کہ اس سے راجہ صاحب کی علم دوستی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ کمالات کا اعتراف بھی کیا ہے۔

قطعہ نما نظم دیوان سحر مملوکہ کتب خانہ نواب آغا ابو صاحب سلطان المدارس لکھنؤ میں موجود ہے جس میں طرار کو مترجم و معاون ''اودھ اخبار'' لکھنؤ لکھا گیا ہے۔ پوری نظم

Scanned with CamScanner

یہاں پر پیش کی جارہی ہے:

قائم رہے جہاں میں نام ونشان اردو — دیر وحرم سنائے صوت اذان اردو
اہل سخن کا رکھے اللہ بول بالا — ہندوستاں کے منہ میں دیگر زبان اردو
اور خاص کر وہ شاعر جو خسرو سخن ہو — دست قوی سے ڈھائے جو ہو عنان اردو
پہلے امیر کہہ لو پھر نام لو حسن کا — اسم مبارک اسکا گویا ہے جان اردو
محمود سے ہوئی ہے آباد جو ریاست — راجہ ہے اس کا معنی بہر بیان اردو
اس کے خطاب اتنے القاب اسکے ایسے — قاصر بیاں سے جن کے ہے یہ زبان اردو
سلطان دین وملت خاقان ملک ودولت — دارائے طبل ورایت شاہ جہان اردو
وہ ماہر سخن ہے وہ شاعر زمن ہے — وہ جان اور تن ہے گویا زبان اردو
دیوان اسکا چھپ کر دنیا سے کہہ رہا ہے — دیکھو شکوہ اردو ہاں دیکھو شانِ اردو
کس ذوق سے ہے آئی غالب کی روح لینے — آتش کو جا کے دیگی یہ ارمغان اردو
دشمن کی رال ٹپکے ہر شعر شکریں پر — ایسی زبان تو ہو بہر دہانِ اردو
اللہ ری طبع عالی ایسے بلند مضموں — پیدا ہے ہر زمیں سے اک آسمان اردو
ان شاعروں کو پہلے پہچانیں کہنے والے — کیا فائدہ جو توڑے یوں استخوانِ اردو
کیا لطف شاعری ہے کیا نعمتیں سخن کی — اک حظ اٹھا رہا ہے مہمان خوان اردو
قرباں ہواس پہ ہو مرصدقے ہواس پہ ملٹن — یہ ہے زبان اردو یہ ہے بیان اردو
ہے آپ کو تلمذ کس خانداں سے حاصل — وہ گھر کہ جس کو دنیا سمجھے ہے کانِ اردو
وہ گھر کہ شاعری بھی کرتی ہے فخر جس پر — ہر شہر میں گڑا ہے جس کا نشانِ اردو
سودا بھی ایک بل تھا آتش بھی پہلواں تھا — توڑی انیس ہی نے لیکن کمانِ اردو
تاریخ طبع دیواں طرار اب سنا دو — دارائے دارا اردو روح وروانِ اردو

۱۳۲۰ھ

۲۴ر نومبر ۱۹۱۴ء/ ۵ر محرم ۱۳۳۳ھ سہ شنبہ کو طرار نے انتقال کیا۔ مجلس چہلم کو مولانا

حکیم سید قاسم علی رضوی نے خطاب کیا۔ یونس کے قطعۂ تاریخ سے طرار کی علمیت اور ان کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے:

نذر اصلاح امور مومنیں فرمود عمر
خیر جو و خیر خواہ فرقۂ اخیار بود
جز ثنائے آل احمدؐ مدحت دیگر نہ کرد
حاسداں در خواب غفلت دائم او بیدار بود
بہر تاریخ وفاتش کرد یونس زیب نظم
شاعر انجام بیں معجز بیاں طرار بود

(۱۳۳۳ھ)

ایک دوسری تاریخ میں بھی یونس نے طرار کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

طرار با کمال ز سادات زید پور — وز دودمان متقی و بے مثال بود
در لکھنؤ گذشت حیاتش بکار دید — مرحوم نیک طینت وقدسی خصال بود
در نثر گر ظہوری وخوش فکر خوانیش — در نظم فخر عرفی نازک خیال بود
یونس ز آب زر بنویسند بہر سال — طرار متقی و سراپا کمال بود

۱۳۳۳ھ

لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کی تاریخ کا مادہ ہے:

مجلس خلد میں موجود ہیں زوار حسین

۱۳۳۳ھ

مشہور قصیدہ گو استاد شاعر محشر لکھنوی نے تاریخ کہی مادہ درج ہے:

از جہاں سوئے ارم دیندار رفت

۱۳۳۳ھ

Scanned with CamScanner

میر انیسؔ اور زید پور

در اصل زید پور کی لغت میں علم ، ادب اور دین ایک ہی لفظ کے تین مفہوم ہیں۔ یوں تو اس بستی کے شعراء نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن یہاں کے زیادہ تر شعراء نے مذہب کے غلبہ کی وجہ سے مذہبی یا عزائی اصناف ہی میں اپنے جوہر دکھائے۔ چونکہ زید پور کے شعراء نے بالواسطہ یا بلا واسطہ انیسؔ و دبیرؔ سے کسب فیض کیا ہے اس لئے اس بستی میں ان دونوں صاحبان کمال کے زیر اثر شعراء کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ علی احمد دانش اس تعلق کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

''یہاں کے عوام و خواص ہمیشہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف مائل رہے۔ وہاں کے بعض افراد تو مرزا دبیرؔ کی طرف مائل تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں انیسؔ کے ماننے والے نہ ہوں۔ خصوصاً میر فضل علی وقار تلمیذ انیسؔ و نفیسؔ [۲۷] وہاں کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہیں کی وجہ سے میر انیسؔ سفر کی زحمت اٹھاتے اور وہاں مجلس پڑھنے جاتے تھے'' [۲۸]

علی احمد دانش نے ڈاکٹر محمد علی رضوی مرحوم کا بیان نقل کیا ہے کہ:

''میر انیسؔ صاحب ایک بار اس قصبہ میں تشریف

لائے تھے۔ یہ بات انہوں نے اپنے ایک بزرگ سے سنی تھی، اس زمانے میں نشست و برخاست کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور آداب محفل معین تھے۔ ڈاکٹر محمد علی مرحوم کے جد بزرگوار حکیم اتحاد حسین کا بیان تھا کہ میر انیسؔ اس دیوان خانے میں ٹھہرے جہاں میر علی صفیر صاحب کا مکان واقع تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ میر انیسؔ اپنی تین گھنٹے کی نشست میں جس انداز سے تشریف فرما تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ قصبہ کے ایک بزرگ اقدس حسین صاحب تھے جو متعدد مرتبہ حج و زیارت سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ میر انیسؔ ان سے حج کی تفصیلات معلوم کرتے رہے مگر اس گفتگو کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ میر انیسؔ حاجی صاحب سے اس طرح بات کر رہے تھے جیسے وہاں کی جگہوں کی پوری طرح سے واقفیت رکھتے ہوں۔ حالانکہ میر انیسؔ نے حج نہیں کیا تھا اور نہ زیارت کربلا سے مشرف ہو سکے۔ اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی کا بیان ہے کہ میر انیسؔ نے سا ہ جی ۲۹ء کے امامباڑے کی تعمیر کے سلسلہ میں تاریخ کہی تھی:

امامباڑۂ فرزند شاہ قلعہ شکن

بہر حال زید پور کو یہ شرف حاصل ہے کہ میر انیسؔ نے امامباڑہ گڑھی میں مرثیہ پڑھا'' [۳۰]

زید پور کی دینی اور ادبی روایت تو یقیناً بہت پرانی ہے لیکن یہاں کی مرثیہ گوئی کے ابتدائی نقوش ہماری معلومات کے حدود سے باہر ہیں۔ جس زمانہ سے مرثیہ گوئی کی مسلسل

Scanned with CamScanner

روایت ملتی ہے وہ انیسؔ و دبیرؔ سے استفادہ کا زمانہ ہے۔ زید پور کی مرثیہ گوئی انہیں دونوں با کمال کی مرہون منت ہے۔ دبیر سے بالواسطہ استفادہ کرنے والوں میں جانشین دبیر اوج کے شاگرد فراستؔ اور یونسؔ کے نام نامی مرثیے کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں اور فیضان انیسؔ، وقارؔ و بدرؔ کی شکل میں طلوع ہوا۔

فضل علی وقارؔ

انیسؔ کے سب سے اہم شاگرد قاری سید فضل علی وقارؔ (م ۱۰۔۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء) زید پور کے ایک معزز رئیس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا عابد حسین زید پور کے تعلقدار تھے۔ وقارؔ کو فن تجوید اور علوم عربیہ پر عبور تھا۔ وہ بڑے پر گو مرثیہ نگار تھے۔ فروغ سیتاپوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''راقم جس زمانے میں مہر نفیسؔ اعلی اللہ مقامہ کی خدمت میں مرثیہ پڑھنے جاتا تھا تو وہاں اکثر سید فضل علی وقارؔ موصوف سے نیاز حاصل ہوتا۔ آپ میرے حال پر بہت شفیق تھے''۔[۳۱]

وقارؔ کے مرثیوں کی ایک جلد ''خورشید خاوری (۱۹۳۷ء)/جلد ریاض وقارؔ (۱۳۵۵ھ) کے تاریخی نام سے شائع ہوئی۔ جس پر میر علی محمد طالبؔ زید پوری نے دیباچہ لکھا اور یونس زید پوری نے اشاعت کی تاریخ کہی:

جناب فضل علی با وقارؔ و عارف تھے
بجا ہے ایسے ہی بندوں کو با خدا کہنا
گل کلام میں خوشبو و رنگ انیسؔ کا ہے
صحیح ہے، نہیں ہرگز غلط مرا کہنا

Scanned with CamScanner

خدا کا فضل ہے مرحوم کا یہ حصہ ہے
ہر اک کا کام نہیں یوں زبان کا کہنا
کلام چھپ گیا ہے دیکھیں صاحبان نظر
بڑھے ہوئے کو ہے لازم بڑھا ہوا کہنا
زروئے حسن یہ تاریخ لکھی یونس نے
وقار کے یہ مراثی ہیں ان کا کیا کہنا
(۸+۱۳۴۷=۱۳۵۵ھ)

فضل علی وقار کی مرثیہ نگاری پر مفصل تبصرہ قمقام حسین جعفری نے اپنی کتاب ''شاگردان انیس'' ۳۲ میں کیا ہے۔ ان کی مجلس چہلم میر نفیس نے پڑھی۔ اس سلسلہ کی ایک رباعی ہے:

درد اکہ عجب یار موافق چھوٹا — صد حیف بڑا محب صادق چھوٹا
کیا حالت دل زباں پہ لاؤں میں نفیس — کافی ہے کہ مجھ سے مرا عاشق چھوٹا

فضل علی وقار کی لاش خان بہادر سید شرف علی (سب جج) نے کربلائے معلیٰ بھجوا دی۔ افسر امروہوی کے مطابق ماہنامہ الواعظ لکھنؤ کے مارچ ۱۹۳۹ء کے شمارے میں ان کے بارے میں ایک مضمون نکلا تھا۔ ۳۳ اس باکمال مرثیہ گو کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ تفصیل کا متقاضی ہے۔ جسے کسی اور موقع پر پیش کیا جائے گا۔ یہاں پر سید فضل علی وقار کے ایک مرثیے کے چند بند بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں جس میں ضربت حیدری کا رنگ قابل دید ہے:

نزدیک اس یہود کے پہنچے جو شاہ دیں
تن کر بہ لاف کبر رجز خواں ہوا لعیں
مرحب میں ہی ہوں جس کا مقابل کوئی نہیں
ہلتا ہے میرے رعب و تہور سے دشت کیں

ماروں جو گرز کوہ گراں پس کے خاک ہو
چمکے جو تیغ جسم زمیں چاک چاک ہو
ماری جو ضرب تیغ شقی نے بصد غضب
لائے سپر کو سامنے شیر الٰہ تب
تلوار اس کی ڈھال میں در آئی اک وجب
تیغ اس کی ٹوٹی ڈھال کو موڑا علی نے جب
پس پھینک کر سپر کو پس پشت شیر نے
چھیڑا سمند قہر و غضب میں دلیر نے
للکارا قصد ضرب کیا شاہ دیں نے جب
درگاہ کبریا سے یہ آواز آئی تب
میکال و جبرئیل و سرافیل با ادب
جائیں محافظت کو زمیں پر فلک سے اب
آیا ہے آج قہر و غضب میرے شیر کو
کیا تاب اٹھا سکے کوئی ضرب دلیر کو
جس قہر میں علیؑ نے علم کی ہے ذوالفقار
بڑھ کر اسی غضب میں کیا گرز دو سے وار
فی الفور دونوں راکب و مرکب کو کر کے چار
گزرے گی تیغ خاک کے طبقوں میں برق وار
سالم بچے گا کوئی نہ سنگ درشت تک
چل کر گرے گی تیغ نہ ماہی کی پشت تک

ایک مرثیہ۔ ع۔ پرچم کشا فلک پہ جو مہر مبیں ہوا۔ میں وقار نے صبح کے منظر نامے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

Scanned with CamScanner

وہ وقتِ صبح اور ظہور آفتاب کا
جھونکے نسیم کے وہ مہکنا گلاب کا
وہ سبزہ زار لطف وہ نہروں کے آب کا
وہ ہر شجر پہ دشت کے جوبن شباب کا
تھا رشکِ خلد کو چمن لالہ زار سے
طاؤس چرخ وجد میں تھا اس بہار سے

اسی مرثیے میں وقار نے جہاں مرثیے کے جملہ اجزائے ترکیبی کو بخوبی برتا ہے وہیں جذبات نگاری کی بہترین عکاسی کی ہے۔ منظر نامہ ہے جناب عون و محمد میدانِ جنگ میں زخموں سے چور ہیں اور اپنے ماموں امامِ وقت کو آخری سلام کر رہے ہیں۔ یہاں پر وقار نے رنج و غم کے ماحول میں بھی فنکاری کا ثبوت دیا ہے:

پہنچی جو شہ کو عونِ دلاور کی یہ صدا
گھبرا کے کی نظر سوئے عباس باوفا
فرمایا پھر کدھر گئے ہمشکلِ مصطفیٰ
تھا میں مجھے کہ جسم میں طاقت نہیں ذرا
دل سنگِ غم سے چور ہے دنیا سیاہ ہے
کچھ سوجھتا نہیں کہ کدھر رزمگاہ ہے

پہنچے جو قتلِ گہ میں شہنشاہِ مشرقین
دیکھا کہ خاک و خوں میں تڑپتے ہیں نورعین
آرام ان کو ہے نہ کسی پہلوان کو چین
دل کو پکڑ کے بیٹھ گئے خاک پر حسینؑ
حسرت سے دونوں شیروں کی جانب نگاہ کی
اٹھا یہ درد شہ کے جگر میں کہ آہ کی

کس درجہ بے قرار تھے سلطانِ کربلا
غش میں پڑے تھے خاک پہ نہ سب کے لب ہلا
ناگاہ آئی موت کی ہچکی غضب ہوا
آغوش میں حسینؑ کے دونوں نے کی قضا
دو کوہِ غم گرے جو دلِ دردناک پر
بیہوش ہو کے گر پڑے شبیر خاک پر

Scanned with CamScanner

الہام حسین الہامؔ و بدرؔ

انیسؔ کے دوسرے فیض یافتہ سید الہام حسین الہامؔ (م ۔شعبان ۱۳۱۷ھ / دسمبر ۱۸۹۹ء) ہیں جن کی تاریخ وفات یونس نے کہی ۔

میر الہام حسین رحلت کرد (۱۳۱۷ھ)

اس تاریخ کے ساتھ نہ تو اشعار ملتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسری تاریخ ۔اس کے سرنامہ میں یونس نے انہیں 'مصنف مثنوی باغ ارم و دیگر کتب فارسی و اردو' لکھا ہے ۔'باغ ارم' فارسی مثنوی ہے جو ۱۳۰۴ھ میں مطبع اثنا عشری لکھنؤ سے باہتمام سید عابد علی طبع ہوئی ۔اس مثنوی کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ الہامؔ فارسی میں شریفؔ تخلص کرتے تھے ۔اس کی تائید منشی مصاحب علی لکھنوی کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

''للہ الحمد کہ مثنوی عجیب و نظم غریب رافع ہموم قلوب مومنین و دافع غموم خواطر مسلمین رشک افزائے نگارخانۂ ارژنگ و مانی آبرو بخش گوہر نظم عرفی و خاقانی محتوی بر حکایات عجیبہ و نکات غریبہ عبارتش نہایت فصیح و شیریں و نظم بانظامش رونق افزائے نظم پروین، مطبوع خاطر ماہران فنون، اشعار آئینہ حیرت نمائے شاعران روزگار، گل سرسبز بہارستان زبان عجم یعنی مثنوی 'باغ ارم' تصنیف شاعر عدیم المثال، جادو مقال،

شہسوار عرصۂ فصاحت، یکہ تاز میدان بلاغت، ناظم اشعار لطیف جناب علامی و فہامی السید الہام حسین متخلص بہ شریفؔ ابن سید اصغر حسین مرحوم متوطن و رئیس قصبہ زید پور۔''

منشی مصاحب علی کی درج بالا عبارت سے سید الہام حسین کی علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔اس کے علاوہ مولوی سید علی میاں کاملؔ محمد آبادی ثم لکھنوی نے مثنوی 'باغ ارم' کی تاریخ کہی جو اکیس اشعار پر مشتمل ہے ۔کاملؔ نے ان اشعار میں الہامؔ کو قادر الکلام شاعر قرار دیا ہے ۔کاملؔ کے ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الہامؔ کا کلام فصاحت و بلاغت کی بہترین مثال ہے ۔انہوں نے الہامؔ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

من ایں نظم مصفا را چو دیدم — زباغ معرفت از ہا رچیدم
برائے سال تصنیفش مرادش — تفکر بود با خاطر ہم آغوش
سرو شے زد ندا بر چشمۂ زہد — بود ایں مثنوی سر چشمۂ زہد
۱۳۰۳ھ

محمد علی زائرؔ نے ایک مصرع میں دو تاریخیں نظم کی ہیں:

کر دز ائر دو سن ہجری بیک مصرع رقم
زاد ملک آخرت — تزئین اہل معرفت
۱۳۰۳ھ — ۱۳۰۳ھ

سید محمد علی زائرؔ اور مولوی علی میاں کاملؔ کے درج بالا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی 'باغ ارم' ۱۳۰۳ھ میں مکمل ہوئی جب کہ ۱۳۰۴ھ میں یہ مثنوی طبع ہوئی ۔جیسا کہ باقر علی رضوی ہنرؔ لکھنوی کے قطعہ تاریخ طبع سے واضح ہوتا ہے:

عجائب مثنوی تصنیف گشتہ — حکایات و نصائح و پند بنہاد
مصنف را بود الہام از غیب — کی ایں نظم مقدس کرد ارشاد
ہنرؔ تاریخ طبعش فی البدیہہ — بگفتہ ۔گلشن فیض ابد باد (۱۳۰۴ھ)

میر سید علی فکر لکھنوی اور منشی مصاحب علی نے بھی قطعۂ تاریخ طبع کہا۔ منشی مصاحب علی کا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے:

صد ہزاراں بر مصنف آفریں — خوب و نادر مثنوی کردہ رقم
سال طبعش اے مصاحبؔ ناگہاں — گشت پیدا از گل باغ ارم

۱۳۰۴ھ

میر سید علی فکر لکھنوی نے بھی اپنے قطعۂ تاریخ میں الہامؔ کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

طبع شد باغ ارم صد شکر از نظم شریف — ہست ہر جانب صدائے مرحبا و آفریں
از پئے تاریخ طبعش فکر کردم زیب نظم — شمع اے جاں افروز بزم عارفین پاکدیں

۱۳۰۴ھ

سید الہامؔ حسین شریف نے جہاں اپنی مثنوی کی خصوصیات بیان کی ہیں وہیں عیسوی اور ہجری سن میں تکمیل مثنوی کی تاریخ بھی کہی ہے:

اگر تاریخ تصنیفش بجویند — سبیل آخرت آں را بگویند

۱۳۰۳ھ

دگر فرمان دل با من رسیدہ — کہ تاریخ مسیحی گوئی چیدہ
نمودم جستجویش چوں فراواں — ز فیض مبدأ فیاض دوراں
گل باغ ارم آمد بدستم — بتار عقل ایں گلدستہ بستم

۱۸۸۵ء

بہر حال الہامؔ اردو و فارسی کے با کمال شاعر تھے۔ 'تجلیات' کے اندراج کے مطابق وہ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں جوان تھے۔ ان کی تصنیف سے دو تاریخیں حسینیہ ظل حسین، زید پور میں آویزاں ہیں اس کا مادۂ تاریخ درج ذیل ہے:

بنائے تاب و مجد و نہاد ظل حسین

۱۲۵۰ھ

دوسری تاریخ سے عیسوی سن برآمد ہوتا ہے:

سال تاریخش مسیحی شد بزیر و بینات
ھٰذا ارواح و فردوس و اطراف نعیم

۱۸۹۰ء

عزیزؔ لکھنوی نے 'تجلیات' ۳۴ میں الہامؔ کے چند اشعار درج کئے ہیں جو انہوں نے مفتی محمد عباس شوستری کے سامنے اس وقت پیش کئے تھے جب انہوں نے ۱۸۵۷ء کی فتنہ سامانیوں کے ایام میں زید پور میں پناہ لی تھی:

فکر وحشت کے دریں خاطر شید اماند است
رم گم کردہ غزالی است بصحرا ماند است
نفس سرد کہ در سینہ من دا ماند است
راہ گم کردہ غریبی است بصحرا ماند است
جوش طوفان سرشک است زبس تا دامن
چشم ما ہم چو حبابے کہ بدریا ماند است
داغ عشق است کہ در سینہ من سوزاں است
یا چراغیست کہ در دامن صحرا ماند است

ولہ

بگلشنے کہ در و تربت شہیداں بود
فضا بجائے نسیم سحر گل افشاں بود
ز تیغ غمزۂ جلاد و چشم خوں ریزش
بقتل بے گنہاں صبح عید قرباں بود
بدشت غربت و شبہائے تار تنہائی
چراغ تربت ما دیدۂ غزالاں بود

Scanned with CamScanner

ولہ

دل را بہ بند طرۂ جاناں گزاشتیم
غربت کشی بشام غریباں گزاشتیم
جاں رفت در ہوائے تو مانند بوئے گل
تن را چو پیرہن بہ گلستاں گزاشتیم
رفتیم از کشاکش دہر آستیں فشاں
دامانِ غم بخارِ مغیلاں گزاشتیم

ولہ

سوخت خرمن ہائے دل برقِ ادائے کیست ایں
آتشِ زد در جہاں رنگِ قبائے کیست ایں
ہم چو بسمل عالمی امروز در خوں می تپد
بے گناہاں عید قربانِ جفائے کیست ایں

ولہ

کجا بودی کہ کشتے از تغافل بے گناہاں را
نشاندی تا کمر در خونِ دل فریاد خواہاں را
برنگِ تو تیا از ہر طرف خاکِ سیہ خیزد
چو ترک غمزہ اش غارت کند ملک صفاہاں را

(تجلیات: ص ۹۲۔۹۱)

الہام کا خوشخط اصلاحی مرثیہ انیس و مونس کی نظر سے گزرا ہوا ذخیرۂ سید محمد رضا عابد (سابق جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا) مقیم مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ میں موجود ہے۔ اس کے سروق پر تحریر ہے۔

'از ملاحظہ میر ببر علی انیس و میر نواب مونس گزشتہ'

غالباً اس مرثیہ پر انیس کے مشورہ سے مونس نے یہ اصلاحیں کیں۔ مقطع میں ان کے تخلص الہام کو بدل کر بدر کر دیا گیا ہے۔

الہام کی مرثیہ گوئی، ان کے عام حالات کی طرح پردۂ خفا میں ہیں۔ بہر حال وہ ایک رئیس باپ کے بیٹے تھے اور باکمال شاعر سید مہدی حسین عبرت زید پوری شاگرد قتیل لکھنوی کے بھتیجے تھے۔ یہاں پر بطور مثال مونس کے اصلاح شدہ مرثیے کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ مرثیہ حضرت علیؑ کی شان میں ہے:

خورشید فلک شمسۂ ایوان علیؑ ہے
مہتاب چراغ چمنستان علیؑ ہے
رضواں جسے کہتے ہیں وہ دربان علیؑ ہے
تقدیر بھی اک تابع فرمان علیؑ ہے
جبریلؑ امیں کون ہیں خادم ہیں علیؑ کے
میکالؑ و سرافیلؑ ملازم ہیں علیؑ کے

عیسیٰؑ نفس صاحب اعجاز علیؑ ہے
احمدؐ کی طرح خلوع میں ممتاز علیؑ ہے
خاصان الٰہی میں سرافراز علیؑ ہے
توڑا در خیبر کو وہ جانباز علیؑ ہے
ہر معرکہ میں پیش نظر تھے تو یہی تھے
محبوب الٰہی میں سرافراز علیؑ ہے

سر پر جو پڑی منھ میں وہ تیغ دوسر آئی
پانی کی طرح منھ سے گلے میں اتر آئی
حلقوم سے پھر سینۂ کافر میں در آئی
سینہ سے جو مرحب کے بڑھی تا کمر آئی

دو کرتے مع اسپ کیا چار لعیں کو
اور کاٹ گئی ایک وجب کر کے زمین کو

درج بالا بند مدح کے تتمے ذیل میں شہادت کے منظر نامے میں بین کا تاثر ملاحظہ فرمائیں:

اب خاک اڑاؤ کہ یہ زاری کا ہے ہنگام
ماتم کرو اور حیدر کرار کا لو نام
جاتے ہیں سوئے خلد شہنشاہ خوش انجام
سر کھولے ہوئے پیٹتی ہیں زینب ناکام
سبطین محمدؐ پہ پڑا وقت غضب کا
ہاں یاد کرو واقعہ انیسویں شب کا

پر کچھ نہ ہراساں ہوا وہ خاصۂ باری
بس ضعف سے حضرت پہ غشی ہوگئی طاری
چلائے نمازی یہ بصد گریہ و زاری
حیدرؑ پہ چلی ہائے غضب ضربت ناری
جو رونق اسلام تھا مارا گیا ہے ہے
بیووں کا یتیموں کا سہارا گیا ہے ہے

خاموش بس اے بدرؔ کہ ہے جوش پہ ماتم
رقت کا یہ عالم ہے کہ مجلس میں نہیں دم
کر عرض علیؑ سے یہی با دیدۂ پرنم
مطلب ہو روا جلد مرا یا شہ اکرم
مل جائے طلب ہے مجھے جس عز و شرف کی
دیکھوں میں ان آنکھوں سے بس اب راہ نجف کی

مخطوطے میں اس مرثیے کے مقطع کا پہلا مصرعہ پینسل سے ع
خاموش ہو الہام کہ ہے جوشش ماتم .....لکھا ہوا ہے۔ جو غالباً
میر مونسؔ کا اصلاح شدہ ہے۔

Scanned with CamScanner

فرزند حسن اثرؔ

بالواسطہ فیضان انیسؔ حاصل کرنے والوں میں اثرؔ اور زارؔ شاگردان نفیسؔ کے نام آتے ہیں۔ سید فرزند حسن اثرؔ زید پوری (م۔۱۳۲۰ھ/۱۳- ۱۹۱۲ء) حیدرآباد میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے حیدرآباد میں عالی شان مکان کے علاوہ زید پور میں ایک شاندار مسجد اور عظیم الشان امامباڑہ تعمیر کرایا۔ ''شجرات طیبات'' اثرؔ کے ادبی کارناموں کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کی ایک بیت مرحوم سید دلشاد حسین زید پوری (صدرالافاضل) سے سید محمد رضا عابد نے سنی تھی:

آخر گلے لگا کے شہ مشرقین کو　　خنجر لہو کے اشکوں سے رویا حسینؑ کو

اس بیت ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اثرؔ کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے۔ زید پور کے بزرگوں کا بیان ہے کہ وہ بڑے صاحب سلوک، سخی اور باذل تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں اثرؔ نے انتقال کیا۔ یونس کی تاریخ سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

صد افسوس رحلت نمود از جہاں　　اثرؔ عبد رب بندۂ پنجتن
بہ پرسند ہمدردیش اہل درد　　سلوکش ز اغیار ہنوز ہموطن
بہر چار سو شہرہ در زید پور　　بلند است آوازہ اش در دکن
رقم کرد یونس پئے سال فوت　　بنز دحسن رفت فرزند حسن
(۱۳۲۰ھ)

آغا علی زارؔ

میر نفیسؔ کے دوسرے اہم شاگرد سید آغا علی زارؔ زید پوری (پ۲- ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۵-۶ء۔ وفات ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) ہیں جن کو پتہ نہیں کس تسامح کی بنا پر افسر امروہوی اور قتام حسین جعفری نے انیسؔ کے شاگردوں میں شمار کیا جب کہ محولہ ''شجرات طیبات'' کی اصل عبارت یہ ہے:

''آپ مرثیہ گو، مرثیہ خواں ارشد تلامذہ میر نفیسؔ اعلی اللہ مقامہ ہیں۔ آپ کا کلام قابل قدر اور لائق تعریف ہے''۔ ۳۵

زارؔ کے مراثی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو مرثیہ نگاری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے مراثی ابھی تک پردۂ خفا میں تھے لیکن ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ 'مراثی زارؔ' کے عنوان سے شائع ہوگیا ہے۔ ایک مرثیے کے دو بند ملاحظہ فرمائیں جو حضرت قاسم کے حال پر مشتمل ہے جس میں زارؔ نے مناظر قدرت کی بہترین عکاسی کی ہے:

ڈالا جو رخ پہ لیلی شب نے نقاب کو
چھینٹوں نے دھویا اوس نے روئے گلاب کو
جب ماہِ نو عروج کو پہنچا شباب کو
جھرمٹ میں تارے لے کے بڑھے ماہتاب کو

Scanned with CamScanner

جو تیرگی کا دور تھا وہ دور ہو گیا
سارا زمانہ نور سے معمور ہو گیا

وہ نور ماہتاب وہ انجم کی صحبتیں
وہ مشتری کی چال یہ خوشیاں وہ فرحتیں
نظارے کو اٹھاتے تھے تارے بھی لذتیں
کیا کیا بندھی تھیں عقد ثریا میں صورتیں

تنویر ماہ میں تھے فلک تا بناک پر
چھنتا تھا نور چاندنی پھیلی تھی خاک پر

وہ چاندنی کا حسن وہ سبزہ بروئے خاک
کیا کیا سماں دکھاتی تھی ہر سو زمین پاک
حسن قمر کی چار طرف سے بندھی تھی دھاک
جلوے سے عکس ماہ کے پانی تھا تابناک

نازاں تھا بحر مجھ سا کوئی سیم بر بھی ہے
دیکھو نصیب لوگوں میں روشن قمر بھی ہے

گھوڑے کی تیز رفتاری، اس کے نعلوں کی تعریف اور براق سے تشبیہ زار کے مرثیوں میں قابل دید ہے جو انہوں نے انیس و نفیس کی تقلید میں قلم بند کیے ہیں:

چہل پل غضب دکھانے لگا اسپ تیز رو
آہو کی طرح سے وہ طرارے واس کی دو
ہر بار ماہ نو کی دکھاتی تھی نعل ضو
گویا کہ چار قدموں سے لپٹے تھے ماہ نو

حیرت ہوئی یہ دیکھ کے ہر شیخ و شاب کو
گردوں مسیر لے کے چلا ماہتاب کو

میر انیس نے تلوار کی تعریف میں ہزاروں بند کہے ہیں۔ زار نے ذوالفقار کی تعریف میں انیس و نفیس کا اسلوب اختیار کیا ہے:

یا علی کہہ کے بہادر نے علم کی شمشیر
پلٹا مانند اسد نادعلی پڑھ کے دلیر
شور تھا اب نہ برھو نیظ و غضب میں ہے شیر
جان بچنے کی نہیں تیغ کے چلنے کی ہے دیر

ہے قیامت کی چمک قدرت داور دیکھو
شوخ رنگت پہ یہ ابھرے ہوئے جوہر دیکھو

اس کے علاوہ زار نے اپنے مراثی میں رجز اور ساقی نامہ کو بھی خصوصی جگہ دی ہے۔ ساقی نامہ کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

ساقیا بادۂ خوش رنگ کا چھلکا ساغر
جام لبریز کو ہونٹوں سے ملا دے لاکر
نشہ جرأت کا ہے دیکھوں گا اب اس کا بھی اثر
میں بھی متوالا ہوں ساقی ہیں جناب حیدر

میکدہ میرا الگ ہے تجھے معلوم نہیں
حب حیدر رہے وہ مخفی نہیں معدوم نہیں

زار زید پوری کے مرثیوں کی درج بالا خصوصیات کے ساتھ ساتھ رخصت کا منظر بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں بین کا تاثر بھی قابلِ دید ہے:

چلاتی تھی یہ فاطمہ کبریٰ اسیر غم
صاحب انھیں گے مجھ سے نہ غربت میں یہ الم
تم تو برات لے کے چلے جانب عدم
ہے ہے تمہارے ہجر میں کیونکر جئیں گے ہم

ساتھی کو بے قصور نہیں چھوڑ دیتے ہیں
دستور ہے دلہن کو تو ہمراہ لیتے ہیں

ہے ہے بنی کے حال پہ تم نے نہ کی نظر
آزردہ مجھ سے کیوں ہوئے اے میرے تاجور
کیا کچھ خلاف طبع ہوا پھر گئے ادھر
کیوں ہم کو چھوڑا ہم تو تصدق تھے آپ پر
تڑپیں گے خاک اڑائیں گے جاں اپنی کھوئیں گے
جب تک جئیں گے بیٹھ کے مرقد پہ روئیں گے

کیا اختیار خیر سدھارو کر و سفر
خالق نگاہبان ہے ہو جائے گی بسر
اے زارؔ اس طرح سے جو بیٹی ہے نوحہ گر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر
شاہا صلہ ملے فصحا میں شمول ہو
فضلِ حسنؔ ہو زارؔ کا ہدیہ قبول ہو

زارؔ دبستانِ انیسؔ کے مرثیہ نگار ہیں۔اس لئے انہیں مرثیے کے جملہ اجزائے ترکیبی خصوصاً بین نظم کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ایک دوسرا مرثیہ جو ہمشکلِ پیغمبر حضرت علی اکبر کے حال کا ہے اس کا مطلع اور دو بند ملاحظہ فرمائیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں بین نظم کرنے کا بہترین سلیقہ ہے:

اے قلم یوسفِ شبیر کی تصویر دکھا
حسنِ بندش کا ہو یہ شور وہ تصویر دکھا
چشمِ خورشید جھپک جائے وہ تنویر دکھا
نورِ احمد کا سراپا دمِ تحریر دکھا

سب ہوں مسرور زبانوں سے دعائیں نکلیں
جز درود اور دہن سے نہ صدائیں نکلیں

لاش اکبر پہ وہ کی بی بیوں نے سینہ زنی
روئے ہاتھوں سے جگر تھام کے شاہ مدنی
کوئی چلاتی تھی پیارے تری کیا شکل بنی
گھاؤ اس طرح کا افسوس یہ نازک بدنی

سینہ پر نور سا یہ قابلِ بیداد نہ تھا
جس نے مجروح کیا صاحبِ اولاد نہ تھا

لاش لے جانے پہ کی آلِ نبیؐ نے جو نظر
در فرقت سے تڑپنے لگے سب پیٹ کے سر
اک قیامت ہوئی جب رو کے پکاری مادر
دیکھو برباد کئے جاتے ہیں ہم کو اکبر
زارؔ اب روک قلم حق کا ولی روتا ہے
خلد میں ماتم ہمشکلِ نبیؐ ہوتا ہے

زارؔ نے اپنے مرثیوں میں نفسیات کا بھرپور لحاظ رکھا ہے جو دبستان انیسؔ کی بنیادی صفت ہے۔زارؔ نہ صرف یہ کہ انیسؔ و نفیسؔ کے بالواسطہ شاگرد ہیں بلکہ ان سے خصوصی لگاؤ بھی رکھتے تھے۔

زارؔ حکیم بندہ احمد کے بیٹے اور سید محمد عسکری تعلقدار زید پور کے چھوٹے بھائی تھے۔یوسؔ نے قطعۂ تاریخ میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں بحر پور خراج عقیدت پیش کیا ہے:

مدح خواں معجز بیاں آغا علی مقبول رب
رفت از دار فنا در خدمت مولا علیؑ

Scanned with CamScanner

مرثیہ گو پیر و طرز انیسؔ خوش بیاں
در دلش ہم برزبانش یا حسین و یا علیؑ
سید عالی گہر زائر رئیس زید پور
بود در دنیا معین حامی است در عقبا علیؑ
نظم ہم می کرد ہم در نثر می گفت ایں سخن
بعد اللہ و نبیؐ یکتا و بے ہمتا علیؑ
از پئے تاریخ مداح علیؑ یونس نوشت
بود زیب بزم مداح علیؑ آغا علی

(۱۳۵۵ھ)

آغا علی زارؔ کو وقارؔ زید پوری سے بھی تلمذ تھا۔ تلمذ وقارؔ پر شاہد سید مبشر حسین سخنورؔ شاگرد و برادر یونس زید پوری کی تاریخ ہے:

عاشق فضل علی شاگرد وے اہل ولا
ذاکر و مداح و زائر بود از نسل رضا
سال فوت او بطرز خاص از ہر یک جدا
در یکے مصرع سخنورؔ ہر دو سن زینت فزا
'باریاب مغفرت' عالی مرتبت آغا علی

۱۹۳۶ء ۱۳۵۵ھ

آغا علی زارؔ نے محرم میں عشرۂ ثانیہ قائم کیا تھا اور اس کے اخراجات کے لئے خاص اپنی جائداد کی آمدنی کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا۔ ان کے بیٹے حکیم سید علی محمد طالبؔ (۱۳۰۰ھ۔۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء تا رجب ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء) ماہرِ زبان سید انور حسین آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ وہ ایک اچھے غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے یہاں کی ماہانہ نشستوں کے باعث زید پور کی ادبی فضا سنوارنے کے بڑی حد تک ذمہ دار

تھے۔ مقبولِ خاص و عام تھے۔ فنِ طب میں حکیم سید باقر حسین اور حکیم سید محمد نواب سے استفادہ کیا تھا۔ آغا علی زار کے ایک عزیز سید قائم رضا نے ۲۰۱۳ء میں زار کے مراثی کو شائع کیا ہے۔ سید محمد رضا عابد کی اطلاع پر راقم السطور نے موصوف سے فون پر رابطہ قائم کیا کہ وہ مجموعہ کا ایک نسخہ دستیاب کرا دیں لیکن انہوں نے معذرت کی کہ ان کے پاس اس مجموعہ کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ جناب سید محمد رضا عابد نے ازراہ کرم اطلاع دی کہ اس مجموعے میں زار کے پانچ مراثی شائع کئے گئے ہیں جن کے مطلع درج ذیل ہیں۔

۱۔ ڈالا جو رخ پہ لیلیِ شب نے نقاب کو (۱۴۷ بند)
۲۔ اے قلم یوسف شبیر کی تصویر دکھا (۱۴۳ بند)
۳۔ یارب مرے سخن میں فصاحت کا رنگ ہو (۱۴۲ بند)
۴۔ اے قلم طبع خداداد کی تصویر دکھا (۵۸ بند)
۵۔ زیب کلام مدحت آل رسولؐ ہے (۱۴۱ بند)

Scanned with CamScanner

شبیر حسن وفاؔ

سید شبیر حسن وفاؔ زید پور کے بہت معروف اور ذی علم خاندان میں ۳؍رجب ۱۳۲۶ھ کو پیدا ہوئے۔ وفاؔ نے بچپن ہی سے ایسا ماحول پایا جس میں صرف تعلیم وتعلم اور شعر وسخن کی گفتگو کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سید شرف علی سب جج آپ کے دادا اور سید عابد حسن بیرسٹر والد تھے۔ انہیں بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔ مشہور مرثیہ گو آغا علی زارؔ کو بہت قریب سے دیکھا جس کی وجہ سے شاعری کا عنصر بچپن ہی سے سرایت کر گیا اور لاتعداد نوحے، غزلیں، سلام، قصائد، قطعات اور چند مرثیے بھی کہے۔ شہرت اور نام ونمود سے بے پرواہ وفاؔ اپنے کلام کو منظر عام پر نہ لا سکے اور بعد میں ان کے ورثا نے بھی اس پر توجہ نہ کی۔ ان کے صاحب زادے حکیم مولانا سید احمد حسن دلؔ زید پوری خود بھی شاعر تھے اور راقم الحروف پر بہت مہربان تھے۔ ان کے دوسرے صاحب زادے سید ساجد حسن (سابق رجسٹرار عربی وفارسی بورڈ الٰہ آباد) اور تیسرے بیٹے مولانا صادق حسن صدر الافاضل لیکچرر و پیش نماز ومبلغ ریاست مرشد آباد (مغربی بنگال) تھے۔ وفاؔ نے زندگی کے آخری ایام اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ مرشد آباد میں گزارے اور ۶؍ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ/۱۹۹۵ء کو وفات پائی۔ نیک اور صالح فرزندوں نے ان کی لاش کربلائے معلیٰ (عراق) بھیجی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ وفاؔ کا کلام کس حالت میں ہے اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں ہے لیکن میرے سینئر اور وفاؔ کے پوتے ساجد رضوی (ایم اے اردو) کے بقول ان کا کلام محفوظ ہے جو

سردست مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ سید عطا مہدی رضوی نے 'انوار زید پور' میں ایک مسدس کے چند بند بطور نمونہ پیش کئے ہیں جس سے ان کی مرثیہ نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

وارث یہ ہر نبی و وصی کے ہیں لاکلام
اللہ نے بنایا انہیں بارواں امام
جس طرح ان کے جد پہ نبوت ہوئی تمام
ان پر اسی طرح ہے امامت کا اختتام
قائم کریں گے دین خدا کے حبیبؐ کا
یہ انتقام لیں گے حسینؑ غریب کا

نصرت کا وقت آیا ہے مولا اب آیئے
منجھدار میں ہے دین کا بیڑا اب آیئے
بے چین سب ہیں آپ کے شیدا اب آیئے
ارباب حق پہ تنگ ہے دنیا اب آیئے
ہے بے قرار تیغ شہ نامدار کی
اب آیئے تو پیاس بجھے ذوالفقار کی

لے لے کے تیغیں جھپٹیں عزادار ہر طرف
ارماں نکالیں آپ کے غم خوار ہر طرف
بجلی سی کوندنے لگے تلوار ہر طرف
ہو جائے گرم موت کا بازار ہر طرف
مصروف کارزار شہ ارجمند ہوں
نعرے حسنؑ حسینؑ کے ہر سو بلند ہوں

چمکے جہاں میں احمدؐ مختار کا علم
حمزہؓ کا اور جعفرؓ طیار کا علم

Scanned with CamScanner

پھر ضو فشاں ہو حیدرِ کرار کا علم
سایہ فگن ہو ان میں علم دار کا علم
ہر سمت آمد شہ والا کی دھوم ہو
اور گرد شیعیان علی کا ہجوم ہو

مرتضیٰ حسن جوشؔ

مولانا مرتضیٰ حسن جوشؔ زید پوری ۱۹۲۹ء کے قریب زید پور کے تعلقہ دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ سید عابد حسن بیرسٹر کے سب سے چھوٹے بیٹے اور سب جج شرف علی مرحوم کے پوتے تھے۔ ان کے بزرگوں کے پاس زید پور کی تعلقہ داری تھی۔ ان کا خاندانی امام باڑہ و مسجد آج بھی عظمتِ پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔

مولانا مرتضیٰ حسن نے ابتدائی تعلیم زید پور میں حاصل کی۔ بارہ بنکی میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے نجف اشرف (عراق) تشریف لے گئے اور ۱۹۷۵ء تک وہیں قیام رہا۔ وطن واپسی پر ان کی صحت خراب رہنے لگی اور بالآخر ۱۲/ مارچ ۱۹۸۶ء کو انتقال فرمایا۔ بقول مولانا حکیم احمد حسن مولانا مرتضیٰ حسن جوشؔ کا کلام زید پور کے جلوسِ محمدی میں بہت مقبول تھا۔ انہیں حاجی وارث علی شاہ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کا کلام دیوی میلے کے مشاعرے اور وارث علی شاہ کے مزار پر بھی پڑھا جاتا تھا۔ جوشؔ ایک عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر اور مداحِ اہلِ بیت تھے۔ شاعری میں اپنے بھائی شبیر حسن وفا سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے مراثی مختصر بیانیہ طرز کے ہوتے تھے۔ جس میں دبستانِ انیسؔ کی نمایاں خصوصیت سادگی اور عام فہم زبان پائی جاتی تھی۔ بطورِ مثال حضرت سکینہ کے حال کے ایک مرثیے کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

جب قید ہوئی شام کے زنداں میں سکینہ
بے آس تھی چھٹنے کا نہ تھا کوئی قرینہ

Scanned with CamScanner

فرقت میں پدر کی اسے دشوار تھا جینا
گرمی کے سبب آتا تھا ماتھے پہ پسینہ
کہتی تھی یہ رو کر شہ والا نہیں آئے
ناراض ہیں کیا مجھ سے جو بابا نہیں آئے

اس قیدِ مصیبت میں الجھتا ہے مرا دم
کیا جانیں یہ دل کروٹیں کیوں لیتا ہے پیہم
زنداں کی مصیبت تھی مرے واسطے کیا کم
یہ اور قیامت ہے کہ بابا سے چھٹے ہم
اندھیر ہے زنداں میں اجالا نہیں ہے ہے
یاں کوئی مرا چاہنے والا نہیں ہے ہے

اس قید میں کس طرح سے بابا کو میں پاؤں
دربند ہیں کیسے میں انہیں ڈھونڈنے جاؤں
کیوں لب پہ میں اپنے سخن یاس نہ لاؤں
قسمت ہی میں لکھا ہے کہ بس ٹھوکریں کھاؤں
بابا کی جو صورت نہ نظر آئے گی لوگو
تن سے یہ مری روح نکل جائے گی لوگو

مندرجہ بالا سطور میں انیسؔ و دبیرؔ سے براہِ راست فیضان حاصل کرنے والے شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن تک راقم السطور کی رسائی ہو سکی ہے جبکہ ان دونوں باکمالوں سے بالواسطہ استفادہ کرنے والے مداحان اہلبیتؑ کی ایک طویل فہرست ہے۔ لیکن وہ میرے موضوع کے دائرے میں نہیں آتے اس لئے ان شعراء کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ شاید تحقیق و تنقید کی نگاہِ توجہ اس موضوع کی طرف مڑے اور رثائی ادب میں ان شعراء کو بھی جائز مقام

زید پور اور دبیرؔ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ زید پور انیسؔ و دبیرؔ کے اثرات سے نہ بچ سکا اور اس کے نتیجہ میں ان کے شاگردوں کی ایک متعدبہ تعداد ہو گئی جس طرح انیسؔ کے بعد نفیسؔ نے اس روایت کو قائم رکھا اس طرح دبیرؔ کے جانشین اوجؔ کے شاگردوں کا سلسلہ باقی رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ زید پور نے دبیرؔ کے اثرات کو زیادہ قبول کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقار اور الہام وزارؔ کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر شاعر سلسلۂ انیسؔ و نفیسؔ کی کڑی نہ بن سکا۔ اُدھر اوجؔ کے دو نامور شاگرد فراستؔ اور یونسؔ جو کثیر التلامذہ استاد تھے انہوں نے دبیرؔ کی روایت کو آگے بڑھایا جس کی وجہ سے وہاں کے شعرا میں دبیرؔ کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔

محمد علی زائرؔ

دبیرؔ کے شاگردوں میں سب سے اہم نام محمد علی زائرؔ کا ہے جو اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ مرثیہ گوئی میں بے مثال، نازک خیال اور تاریخ گوئی میں طاق تھے۔ آپ کا اکثر کلام صنائع و بدائع میں ہوتا تھا۔ دبستان دبیرؔ میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''حاجی سید محمد علی زائرؔ شاگرد مرزا دبیرؔ زید پور ہی کے رہنے والے تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے تھے اور عملہ شاہی میں ملازم

Scanned with CamScanner

ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا تو مرزا صاحب
کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ اساتذہ
میں شمار ہونے لگے۔ انتزاع سلطنت اودھ سے اتنے خاطر برداشتہ
ہوئے کہ زید پور واپس چلے آئے''۔ ۳۶

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ان کی تاریخ وفات ۱۹۰۷ء بتائی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یونس زید پوری نے ان کی وفات کی تاریخیں نظم کی ہیں جس سے ۱۳۳۱ھ/۱۳-۱۹۱۲ء برآمد ہوتا ہے:

از نور کلام زائر اختر اختر
روشن پُر نور مغرب و مشرق گشت
تاریخ وفات نظم خیلے شد
ہر کس بر حسن دلکیش عاشق گشت
تاریخ تخلص اسم یونس بہ نوشت
زائر بہ محمد و علی ملحق گشت
(۱۳۳۱ھ)

یونس از مصراع زائر جست سال رحلتش
جس کے دہرانے میں ہے قند مکرر کا مزا
گفت گو یا زائر گو یا بمن ہنگام فکر
پڑھ مرا مصرع اٹھا کچھ میرے جوہر کا مزا
بے درنگ و بے تردد بے سر فکر ایں بخواں
پا رہا ہوں قبر میں آغوش مادر کا مزا
(۱۳۳۱ھ)

یونس کی درج بالا تاریخوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زائر نے ۱۳۳۱ھ

مطابق ۳-۱۹۱۲ میں وفات پائی ہے۔ زائر کے مطبوعہ کلام میں جو کچھ تھا وہ بھی نایاب کی حد تک پہنچ گیا اور غیر مطبوعہ کلام اگر پوشیدہ خزانوں میں نہیں تو تلف سمجھنا چاہئے۔ ان کی ایک طویل مثنوی ''گوہر اسرار'' کے نام سے ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۳ء) میں مطبع جعفری لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ دوسری مثنوی ''فوائد آخرت'' فارسی میں تھی۔

انتزاع سلطنت اودھ کا زائر کو بڑا صدمہ تھا اس لیے کہ زائر خود اس سے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ ''گوہر اسرار'' میں یہ مناجات موجود ہے جس سے ان کے دلی رنج کا پتہ چلتا ہے:

الٰہی ہے اک اور یہ آرزو — کہ کر لکھنؤ کو پھر آباد تو
یہی ہے تمنا، یہی ہے مراد — کہ وہ شہر آباد ہو اور شاد
الٰہی خزاں میں دکھا دے بہار — وہی شہر ہو، پھر وہی شہر یار
نہ ہو نام کو رنج و غم کا نشان — وہ تختہ ہو پھر رشک باغ جناں
اگر شاہ اختر وہاں آئیں پھر — تو ہم سب کے اختر چمک جائیں پھر
کریں چاند سے رخ کی جس روز دید — ہمارے لیے ہو وہ دن روز عید
الٰہی نہیں تیری رحمت سے دور — مجھے پھر وہ ساماں دکھا ناضرور

درج بالا مناجات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''زائر پرانے وقتوں کے آدمی تھے جب آزادی اور جمہوریت کے وہ تصورات عام نہیں ہوئے تھے جو آج سارے ملک میں عام ہیں لیکن اودھ پر انگریزوں کے قبضہ سے ان کے دل کو دکھ پہنچنا اور دوبارہ شاہی کے قیام کی آرزو کرنا ان کے جذبۂ حب الوطنی کا ثبوت ہے اور مذکورہ بالا اشعار ان کی حریت پسندی کا ایک مظاہرہ ہیں۔ انگریزی عملداری کے قیام کے بعد ان کا اس قسم کی مناجات چھپوا دینا ان کی جرأت کردار کا بھی ایک اچھا ثبوت ہے'' ۳۷

زائر اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی فارسی مثنوی ''فوائد آخرت''

Scanned with CamScanner

قطعات تاریخ طبع 'گلدستۂ معانی ومثنوی باغ ارم' کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے غیر منقوط فارسی قصیدہ سے چند شعر نقل کرتے ہیں جس کو ''دبستان دبیر'' میں ذاکر حسین فاروقی نے پیش کیا ہے۔ اس قصیدہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں فارسی پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی:

مطلع مہر کرم وعلم وحلم — محرم اسرار رسول امم
موہم اسرار ملک علم او — علم ملک کم ملکہ کا لعدم
مہر ہمہ حورارم مہر او — اہل ولا مورد مہر کرم
دردوسرا حاسد اورامدام — حاصل ہر علم وعمل لاولم
مرگ سر عسکر اعدا ہمہ — عدل دل آرام امام امم
مہر سما مہرہ درگاہ او — لمعۂ عکس درا و ماہ ہم
گرد درگہ او ہر سحر — کحل ملک سرمۂ حورارم
داد احد در اُحد اور احسام — کرد مدد گار رسول امم

قصیدہ بہت طولانی ہے۔ یہاں پر چند شعر پر اکتفا کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی علمی استعداد کافی اچھی تھی۔ ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ ''مراثی میں زائر بہت ہی ہلکی پھلکی سلیس اور نازک زبان استعمال کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کے مراثی بڑے مبکی اور پر تاثیر ہوتے تھے''۔ ان کا ایک مرثیہ معصومۂ قم کے حال کا ہے جس میں امام حسینؑ سے جناب زینب کی روایتی محبت کا ذکر کرنے کے بعد امام رضا کی جدائی میں ان کی بہن حضرت معصومۂ قم کی کیفیت کچھ اس طرح بیان کی ہے:

جس طرح وہ تھیں عاشق فرزند پیمبرؐ
معصومہ بھی شیدا تھیں اسی طرح رضا پر
جاتے تھے غریب الغربا گھر سے جو باہر
رہتی تھی مکاں میں نظر ان کی طرفِ در

جب تک نہ امام دوسرا آتے تھے گھر میں
بدتر تھا وہ گھر قبر سے بھی ان کی نظر میں
لکھا ہے گئے طوس کی جانب جو رضا آہ
معصومہ کے دل پر تھا عجب صدمۂ جانکاہ
گھٹتی تھی غم و رنج سے ہر دم صفت ماہ
کرتی تھی بسر رونے میں دن رات وہ ذی جاہ
مشتاق تھی دیدار ولی ابن ولی کی
تھی لب پہ صدا ہائے اخی ہائے اخی کی
رہتی تھی سدا یاد میں بھائی کی وہ مضطر
خاموش پڑی رہتی تھی یا روتی تھی دن بھر
جاتی تھی کبھی منتظر خط طرف در
گہہ کہتی تھی عرصہ ہوا آئے نہ برادر
کیا وجہ جو یوں دل سے بھلایا مجھے ہے ہے
خود آئے نہ پاس اپنے بلایا مجھے ہے ہے
جب کہتی تھیں ہمسائیاں با نالۂ وافغاں
رو رو کے نہ جاں کھوئیے ہم آپ پہ قرباں
رونے کے عوض حق سے دعا مانگئے ہر آں
لائے انہیں گھر خیر سے پھر ایزد سبحاں
گو دل کو تسلی کسی اسلوب نہیں ہے
پر رونا مسافر کے لیے خوب نہیں ہے
فرماتی تھیں تب ان سے یہ شیدائے برادر
کس طرح کروں ضبط بکا آہ میں مضطر

Scanned with CamScanner

آگاہ مرے حال سے ہے خالق اکبر
مجبور ہوں میں کیا کروں قابو نہیں دل پر
یہ درد جدائی یوں ہی تڑپائے گا مجھ کو
بن بھائی کے لو گو نہ قرار آئے گا مجھ کو

درج بالا بندوں میں ایک بہن کے جذبات کی جو عکاسی کی گئی ہے اور زبان کی شیرینی اور نرمی نے بیان میں جو تاثیر پیدا کر دی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ زائر کے مراثی کا عام رنگ یہی ہے لیکن انہوں نے کہیں کہیں اپنے استاد دبیر کی پیروی بھی کی ہے۔ ایک مرثیے میں استاد کا رنگ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے:

آب دم شمشیر زباں وصف علیؑ ہے
سرسبزی بستان بیاں وصف علیؑ ہے
سنگ گہر درج دہاں وصف علیؑ ہے
دیندار کے ایماں کا نشاں وصف علیؑ ہے
رتبہ ہے عجب شیر خدائے ازلی کا
قرآں بھی ہے اک جزو کہن وصف علیؑ کا

اس اسم کا ہر حرف سعادت سے بھرا ہے
پرعین کا کیا عز و شرف صل علیٰ ہے
دیکھیں نہ اگر اہل نظر عین خطا ہے
ممتاز اسی عین سے عین ملا ہے
جس عہد کے تارک سے یہ اک آن جدا ہو
بد سب کی نگاہوں میں وہ بندہ بخدا ہو

ہے چشم زمانہ کی اسی عین سے بینا
دیکھو ہے اسی وجہ سے تاج سر عیسیٰؑ

گر قرب سے اس کے وہ سرافراز نہ ہوتا
ملتا نہ کبھی عرش معلیٰ کو یہ رتبہ
وصف اس کا ادا ہو نہیں سکتا ہے کسی سے
آفاق میں جز شرع کی قائم ہے اسی سے

اب لام کے اوصاف سُنیں صاحب اسلام
ہے ختم رسولوں کا اسی لام پہ انجام
کیوں کر نہ رہے ورد زباں یہ سحر و شام
کلمہ کی بنا کے لیے مبدا ہے یہی لام
ہستی ہے اسی لام سے آلات رقم کی
گر لوح کا یہ سر ہے، تو ہے جان قلم کی

یا کے بھی ہیں اوصاف دو عالم پہ ہویدا
ہے زیب دہ سورۂ یٰسین یہی یا
فرق ید بیضا پہ جو یہ تاج نہ ہوتا
ہوتا نہ ضیا میں کبھی اسی طرح کا شہرہ
کس طرح نہ ہر دل میں ہو جوش اس کی ولا کا
آغاز اسی سے تو ہوا یاد خدا کا

درج بالا بندوں میں دبستان دبیر کی مضمون آفرینی صاف نمایاں ہے۔ زائر نے سلام کی مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی بڑے خوبصورت اشعار نکالے ہیں:

جہاں کی خاک ہے واں کھینچ کر لے جائیگی بے شک
پڑی ہے پاؤں میں ہر شخص کے زنجیر مٹی کی
بشر میں ہے فقط سر تا بہ پا اک صنعت خالق
وگرنہ غور سے دیکھو تو ہے تصویر مٹی کی

Scanned with CamScanner

زباں داں ہیں مقرر زائر مری اس خوش بیانی کے
وہ خوش تقریر ہوں بلبل کی بھی تقریر مٹی کی

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی (کراچی پاکستان) کے کتب خانے میں زائر کا ایک مرثیہ موجود ہے جس کا مطلع ہے:

جب روز دہن شاہ کا یاور ہوئے بے سر
دریا پہ علم دار دلاور ہوئے بے سر
اور کھا کے سناں سینے پہ اکبر ہوئے بے سر
تھا عصر کا ہنگام کہ سرور ہوئے بے سر
پامال ہوئی لاش دل و جان نبیؐ کی
تا شام لٹی آل رسولؐ عربی کی

زائر نے اس مرثیہ میں جناب ام حبیبہ کی روایت نظم کی ہے۔ مرثیے کا مقطع ہے:

جس دم یہ کہا زینب ناشاد نے رو کر
سر پیٹ کے رونے لگیں وہ عاشق سرور
خاموش ہو للہ اب اے زائر مضطر
زینب سے یہ کر عرض کہ اے دختر حیدرؑ
دامن کو مرے گوہر مقصود سے بھر دے
اپنی بھی زیارت سے مشرف مجھے کر دے

بقول سید محمد رضا عابد زائر کا توسل ریاست حیدرآباد سے بھی تھا۔ آخر میں وطن آ گئے تھے جہاں ۱۳۳۳ھ کو ۹۰ سال سے زائد عمر پا کر انتقال کیا۔ حج و زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ مجرد رہے اور کلام بھی محروم اشاعت رہا۔ یونس زید پوری نے تاریخ کہی:

تاریخ تخلص اسم یونس بنوشت — زائر بہ محمد و علی ملحق گشت
۱۳۳۱ھ

مونس حسین مصیبؔ

دبیرؔ سے بلا واسطہ اکتساب کرنے والوں میں عالم جلیل، ذاکر حسین اور باکمال مرثیہ گو مولانا مونس حسین مصیبؔ ہیں جو ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کے قریب پیدا ہوئے۔ دنیائے ادب کی نظر میں ''دربار حسین'' میں شائع چند بندہی آپ کی یادگار ہیں:

رخصت ہوئے سبھوں سے شہنشاہ انس و جاں
اہل حرم کی آنکھوں سے آنسو ہوئے رواں
ڈیوڑھی پہ آئے روتے ہوئے شاہ دو جہاں
فوج ستم سے چلنے لگے تیر ناگہاں
بولے حضور غازیوں سے کیا صلاح ہے
لاؤ ہمارے پاس کدھر ذوالجناح ہے

ناگاہ آیا سامنے حضرت کا راہوار
عباس نے رکاب کو تھاما بصد وقار
پشت فرس پہ قبلۂ عالم ہوئے سوار
ہمراہ تھا علم لئے حیدر کا یادگار
جس وقت پہنچے فوج مخالف کے سامنے
حجت تمام کی شہ گردوں مقام نے

فرمایا ابن سعد سے اے بانیِ جفا
آیا ادھر بلا نے پر فرزند مصطفاؐ
پاس و لحاظ چاہیے مہمان کا سدا
اور مجھ کو تین روز سے پانی نہیں ملا
مہماں پہ ظلم کرنا مروت سے دور ہے
اہل عرب کی شان حمیت سے دور ہے

بولا غضب میں آ کے وہ مردود بے حیا
بیعت سے میر شام کی انکار کیوں کیا
لاحول کہہ کے چپ ہوئے سلطان کربلا
واں حر کا جسم خوف سے تھرا کے رہ گیا
آیا اڑا کے رخش وہ شہ کے حضور میں
اک موج اور مل گئی دریائے نور میں

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ان بندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کلام کی سادگی اور روانی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصیبؔ اچھے مرثیہ گو ہوں گے''۔ ۳۸

مصیبؔ کا انتقال ۴؍جمادی الاول ۱۳۲۶ھ/ ۵؍جون ۱۹۰۸ء بروز جمعہ ہوا۔ یونس نے لفظ ''مغفوراً'' اور کسی اہل فن نے ''رفتہ بہ خلداً'' سے تاریخ نکالی اور میر اولاد حسین (آہ) کشوری نے ایک بیت سے:

چارم ز شہر پنجم واز جمعہ شب گزید — مونس حسین خلد بنقد ہدیٰ خرید

فراست کا مادۂ تاریخ ہے ع

شد مونس حسین بدربار پاک شاہ (۱۳۲۶ھ)

یونس زید پوری نے جہاں اپنے والد کی تاریخ لفظ ''مغفور'' سے نکالی وہیں دوسری

تاریخیں بھی نکالی ہیں جس سے ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے:

بجنت مولوی مونس حسین با خدا رفت — حضور خامس آل عبا اہل ولا رفت
برائے سال ہجری یونس ایں جملہ رقم کرد — بہیں اے جوہری الفاظ یا گوہر بہم کرد

۱۳۲۶ھ

ایک اور تاریخ ہے۔ ع..... ہزار و نہ صد و ہشت سال عیسوی

۱۹۰۸ء

ایک دوسری تاریخ میں یونسؔ نے اپنے والد کا خوبصورت تعارف پیش کیا ہے:

مولوی مونس حسین از فضل رب دوجہاں — در جوار پنجتن ایوان زیبا یافتہ
شاعر آل محمد زائر سبط رسولؐ — صورت تسنیم و کوثر خلد وطوبا یافتہ
از عطائے رب سر تاریخ یونس نظم کرد — غوطہ در بحر سخن چوں زد گہر ہا یافتہ
گشت از یک لفظ 'مغفور' آشکارا سال فوت — قطعۂ تاریخ زیں رونق دوبالا یافتہ

رفت ہم چوں بوئے گل سوئے جناں مونس حسین (۱۳۲۶ھ)
در جناں شیدائے سبطین نبیؐ جا یافتہ (۱۳۲۶ھ)

مصیبؔ کے چار فرزند تھے جن میں یونس نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ یونس کے علاوہ مفوض حسین نصیریؔ، سید متوسط حسین اکملؔ اور سید مبشر حسین سخنورؔ جواوج اور یونس کے شاگرد تھے۔

Scanned with CamScanner

برکات احمد نجمؔ

اوجؔ کے تلامذہ نے زید پور میں ادب کی بنیادوں کو مستحکم ہی نہیں کیا بلکہ ان کے دو شاگردوں فراستؔ اور یونس کے فیضانِ تربیت یا ان کے کمال کی چھوٹ نے زید پور کے بچے بچے کو شاعر بنا دیا جن کے اثرات آج تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہیں کے ایک معاصر، شاگرد اوجؔ، نجمؔ زید پوری ہیں۔ مولوی برکات احمد نجمؔ (۱۲۹۰ھ۔۴ رذی الحجہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۸۷۳ء۔۳/۲ دسمبر ۱۹۴۲ء) کے مبکی اور دلگداز نوحوں کی امتیازی شان ہے۔ ان کے نوحہ کا ایک مطلع ہے:

چھوٹا وطن حسینؑ غریب الدیار سے بیٹے کے ساتھ فاطمہ نکلیں مزار سے ۳۹

نجم ممتاز عالم دین، ذاکر اور صف اول کے نوحہ نگار تھے اور اپنے مخصوص انداز سے نوحہ خوانی بھی کرتے تھے ان کے نوحوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید عنایت حسین جلالوی نے لکھا ہے:

''آج بھی حضرت متینؔ بھرت پوری کے نوحوں کا جو انداز ہے .....وہ اپنی مثال آپ ہے اور تقریباً یہی رنگ حضرت نجمؔ زید پوری کے نوحوں کا بھی ہے .....سوز و گداز سے بھرپور بینیہ انداز، آہ و بکا کا سرچشمہ، جذبات کی مکمل عکاسی، سیدھی سادی زبان الفاظ نہیں بلکہ نشتر اور نوحہ کے لیے کیا چاہیے۔'' ۴۰

وہ صرف نوحہ نگار ہی نہ تھے بلکہ ممتاز صاحب طرز محدث اور عالم جلیل تھے۔ مولانا حکیم سید مرتضیٰ محمد (زید پوری) مدرس معقولات جامعہ سلطانیہ لکھنؤ ان کے اساتذہ میں تھے۔ اوجؔ کے شاگردوں

میں نمایاں مقام حاصل ہے لیکن ''دبستان دبیرؔ'' ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کے صاحبزادے مولانا سید حیدر مہدی نے ان کے نوحوں اور قصیدوں کو مرتب کیا تھا لیکن اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ نوحوں کا ایک مختصر مجموعہ ''آہ و بکا'' کراچی سے شائع ہوا۔ ان کی وفات پر یونس نے تاریخ کہی:

نظم غم بر مصرع تاریخ یونس ختم کن
پیش احمد رفت نجمؔ کامل و اہل کمال

۱۳۶۲ھ

تعجب ہے کہ نجم زید پوری سے جیسے باکمال شاعر کا ذکر ''دبستان دبیرؔ'' یا دبیرؔ سے متعلق دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔ ان کا ایک مرثیہ ع۔ جو شرف خالق اکبر نے دیا کبریٰ کو..... جناب فاطمہ کبریٰ کے حال کا یادگار ہے۔ مرثیے کے دو بند پیش کئے جا رہے ہیں جس میں نجمؔ نے جناب فاطمہ کبریٰ کا تعارف بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

درۃ التاج سر بنت سلیماں ہیں یہی
شرف والدۂ موسیٰ عمران ہیں یہی
فخر حوا یہی مخدومۂ دوراں ہیں یہی
رونق بزم عزائے شہِ ذیشاں ہیں یہی

پیٹتے پیٹتے جب سانس اکھڑ جاتی تھی
غش میں بھی ہائے حسینا کی صدا آتی تھی

آپ کو زینت محراب عبادت کہئے
آپ کو آب در گوش طہارت کہئے
آپ کو غازۂ رخسارۂ عصمت کہئے
ہے بجا گر چمن آرائے مصیبت کہئے

تن سے اترا نہ کبھی رخت عزا بابا کا
جب تلک جیتی رہیں سوگ رکھا بابا کا

Scanned with CamScanner

جناب قاسم اور حضرت فاطمہ کبریٰ کا عقد واقعۂ کربلا کا ایک اہم موضوع ہے۔ نجم زید پوری نے اسی مرثیے میں اس واقعہ کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

بڑے بھائی کی نکالی شہ بیکس نے قبا
اور پہنایا بھتیجے کو حسن کا جامہ
باندھ کر فرق پہ قاسم کے عمامہ اُن کا
ہاتھ کبریٰ کا لیا ہاتھ میں اور عقد پڑھا

خیمہ خالی کیا عباس دلاور نکلے
مثل ارمان حسنؑ سبط پیمبرؐ نکلے

مغتنم جان کے وہ چند نفس کی فرصت
دیکھی نوشاہ نے حسرت سے دلہن کی صورت
دیکھتے تھے ابھی چہرہ بنگاہ حسرت
کہ ہوئی پیش نظر آئینہ بن کر فرقت

فوج اعدا میں مبارز طلبی ہونے لگی
ہاتھ مل مل کے مرادان کے یہاں رونے لگی

ہمارے مرثیہ نگاروں اور نوحہ نگاروں نے جناب کبریٰ کے حالات کو کربلا ہی تک محدود رکھا ہے۔ واقعۂ کربلا کے بعد ہمارے زیادہ تر مرثیہ نگار خاموش ہیں۔ نجم نے اپنے مرثیے میں جناب فاطمہ کبریٰ کی واقعۂ کربلا کے بعد کی زندگی کا ذکر بھی کیا ہے اور چونکہ زید پور میں جناب فاطمہ کبریٰ کے تابوت اٹھانے کی رسم ہے اس لئے ان کی شہادت کا ذکر بھی نجم نے کیا ہے۔ اس سلسلے کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

اہل تاریخ نے لکھا ہے مفصل یہ حال
سوگ میں باپ کے کبریٰ رہیں ستاون سال

دل پہ چھایا ہی رہا ابر غم و رنج و ملال
کبھی کی سینہ زنی کھولے کبھی سر کے بال
کبھی نالے کئے عباس دلاور کے لئے
دھانپ کر منہ کبھی روئیں علی اکبر کے لئے

آخر الامر ہوئے موت کے آثار عیاں
آئے بالیں پہ عیادت کے لئے خرد و کلاں
روبرو ان کے عقاید کا کیا اپنے بیاں
کلمہ پڑھ کے ہوئیں پھر وہ سوئے فردوس رواں

گل ہوا بجھ گئی لو شمع حیات کبریٰ
ہائے افسوس ہوئی آج وفات کبریٰ

فاطمہ کی تھی جو تصویر وہ بی بی نہ رہی
چاہتے تھے جسے شبیر وہ بی بی نہ رہی
جو تھی سجاد کی ہمشیر وہ بی بی نہ رہی
جس سے شیرب کی تھی توقیر وہ بی بی نہ رہی

دوست رکھتے تھے جو اس نیک چلن کو قاسم
خلد میں لے گئے ساتھ اپنی دلہن کو قاسم

بین کرتی رہی ہمشیر بصد سوز و گداز
لائے تابوت بقیعہ میں عرب کے ممتاز
اہل تاریخ کی آنکھوں سے ہے پوشیدہ یہ راز
غالباً حضرت باقر نے پڑھائی ہو نماز

نہیں معلوم کہاں دفن وہ محزون ہوئیں
ہے گماں پہلوئے سجاد میں مدفون ہوئیں

Scanned with CamScanner

مفید حسن مفیدؔ

نجم زید پوری ہی کے عہد میں ایک اور شخصیت ملا مفید حسن مفیدؔ کی ہے جو مولوی خادم حسین کے بیٹے ہیں۔ مولوی خادم حسین شاہان اودھ کے استاد حافظ الدولہ مولانا مہدی حسین کے بھتیجے تھے اور حکیم شرف الحسین (م ۱۳۲۲ھ) کے بھانجے اور علامہ ناصرؔ زید پوری کے نانا تھے۔ متعدد جگہوں پر پیش نماز رہے، ناصر الملۃ کے تلامذہ میں شمار ہوتا تھا لیکن مشورۂ سخن کس سے تھا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ گمان غالب ہے کہ اوجؔ کی شاگردی اختیار کی ہوگی۔ مفیدؔ کو بھی تذکروں میں جگہ نہیں مل سکی۔ ملا حسن مفیدؔ زید پوری کا ایک مرثیہ جناب امام زین العابدین کے حال کا ہے جس کے چند بند بطور مثال درج کئے جا رہے ہیں۔ مرثیہ کے ان بندوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مفیدؔ خاصے ذی علم شاعر تھے:

عابد کا صبر و حلم جہاد عظیم ہے
پابند حکم رب غفور الرحیم ہے
ہر صدمہ و ملال میں دل مستقیم ہے
ان کی رضا وہی جو رضائے کریم ہے
بیڑی کا سلسلہ نہ قدم سے جدا کیا
طوق گراں پہن کے بھی شکر خدا کیا

گریاں غم حسین میں تنہا نہیں فلک
شمس و قمر بھی روئے ہیں چالیس دن تلک
روئے ہیں اس مصیبت جانکاہ میں ملک
کرو بیان عرش کی بھی تر ہوئی پلک
سکان ارض اہل سماوات روئے ہیں
یہ وہ الم ہے جس میں جمادات روئے ہیں

کیوں کر نہ روئیں اپنی مصیبت پہ زار زار
آزار ایک دل پہ اٹھائے ہیں بے شمار
سوکھا گلا کہاں وہ کہاں طوق خاردار
جز بیکسی نہ تھا کوئی حضرت کا غم گسار
صدمہ پہ صدمہ تھا یہ تن چاک چاک پر
طوق گراں سے زخم پڑا حلق پاک پر

آخر تڑپ کے سید سجاد نا تواں
شوق بقائے حق میں ہوئے عازم جناں
پچیسویں جو ماہ عزا کی ہوئی عیاں
دنیا سے سوئے خلد سدھارا وہ نیم جاں
پنجاہ و ہشت سال کے سن میں گزر گئے
بیٹو محبو! سید سجاد مر گئے

جب اٹھ گیا جہاں سے دو عالم کا مقتدا
پائی نہ اپنے وقت پہ محتاجوں نے غذا
یہ راز ان فقیروں کو معلوم تب ہوا
کھلواتا تھا طعام یہی خاصۂ خدا
کہتے تھے آہ مالک ہر دو سرا گیا
ہم سب کی آس ٹوٹ گئی آسرا گیا

Scanned with CamScanner

سعادت حسین سعیدؔ

مولانا نجم زید پوری اور ملا مفیدؔ کے عہد میں ایک اہم شاعر سعادت حسین سعیدؔ ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کس سے تلمذ تھا یہ بھی پتہ نہیں لیکن مراثی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خاص طور سے انہیں رزم نگاری میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ بطور مثال چند بند ملاحظہ فرمائیں:

تیغ علیؑ کو آپ نے کھینچا نیام سے
منہ موڑا عافیت نے وہیں فوج شام سے
تولی جو ذوالفقار علیؑ دھوم دھام سے
فتح و ظفر لپٹ گئی دست امام سے
قتل عدو پہ موت نے واں قہقہے کئے
طوطیِ ذوالفقار نے یاں چہچہے لئے

ناگاہ فوج شام پہ صبح فنا چلی
یعنی حسام حضرت مشکل کشا چلی
پڑھتی ہوئی زباں سے ظفر کی دعا چلی
یا ذوالفقار کہہ کے جلو میں قضا چلی
سایہ نے سب کی آنکھ سے پردہ اٹھا دیا
گردن پکڑ کے تیغ کے نیچے بٹھا دیا

فراست حسین فراستؔ

دبستان زید پور کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو وہاں کے دو شعرا فراستؔ اور یونسؔ کا نام جلی حرفوں سے لکھا جائے گا اس لئے کہ ان دونوں حضرات نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک جماعت کی تربیت کی جس نے ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ فراستؔ اور یونسؔ کی قائم کردہ بنیادوں کو بھی مستحکم کیا اور اس دور کو زید پور کی ادبی تاریخ کا زریں دور بنا دیا۔

سید فراست حسین فراستؔ (۷؍ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ تا ۲۷؍صفر ۱۳۷۲ھ۔ مطابق ۲۶؍جون ۱۸۷۱ء تا اکتوبر ۱۹۵۲ء) سید ضامن حسین کے بیٹے اور شاگرد قتیلؔ مہدی حسین عبرتؔ کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ ۱۹؍سال کی عمر میں پہلا مرثیہ کہا اور حضرت اوجؔ مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے شاگردی اختیار کی۔ بڑے صاحب مطالعہ اور زود گو تھے۔ قصیدہ سلام، نوحہ، قطعات کہے لیکن مرثیہ میں نام پیدا کیا۔ انکی زود گوئی اور کلام کے مبنی بر مطالعہ ہونے کا ذکر ان کے شاگرد محسنؔ زید پوری نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے:

حال جس ناصر حضرت کا نظر سے گزرا
اسی موضوع پر اک مرثیہ تصنیف ہوا
رات کو نظم کیا صبح کو مجلس میں پڑھا
دوسرا ایسا نہ دیکھا ہنر آرا ایسا

Scanned with CamScanner

زود گوئی کے ہنر کس نے کب ایسے پائے
کوئی اس ذہن خداداد کو کیسے پائے

محسنؔ نے دوسری جگہ اپنے استاد کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کلام کی وسعت اور موضوعات کی گہرائی کا اعتراف انہیں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

ہے اس قدر کلام کہ جس کا نہیں حساب
سارا یہ ان کا دفتر مدحت ہے انتخاب
جلدیں ہوں تیس طبع ہو گر نظم لاجواب
جس طرح تیس پاروں میں ہوا یزدی کتاب
جس کی ثنا و مدح میں قرآں تمام ہے
مدحت میں ان کی یہ بھی سخن لاکلام ہے

محسنؔ نے اپنے استاد فراستؔ کو زید پور کا سب سے اہم شاعر تسلیم کیا ہے اور انہیں سرآمدِ شعرا کہتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا شہرہ ممالک غیر تک ہے:

نو سو برس ہوئے کہ ہے آباد زید پور
شاعر جو گزرے یاں وہ ہیں مشہور دور دور
حاصل تھا فن شعر میں بیشک انہیں شعور
لیکن نہ بحر نظم کو یوں کر سکے عبور
بے جا نہیں سبھوں سے جو بہتر کہوں انہیں
حق ہے سرآمد شعرا گر کہوں انہیں

مضمون بڑھے ہوئے ہیں مضامین میر سے
پایا وہ اوج مدح جنابِ امیر سے
چھوٹا نہ وہ فراستؔ روشن ضمیر سے
کہنا جو رہ گیا تھا انیسؔ و دبیر سے

شہرت ہے شہر شہر جناں میں مقام ہے
کیا لکھنؤ عراق تلک ان کا نام ہے

''ماہ کامل'' کے حوالے سے فراستؔ زید پوری نے ایک ہی بحر میں دو ہزار بند کا مرثیہ کہہ کر ایک طرح سے اہلبیت علیہم السلام کی منظوم تاریخ لکھنے کی طرف قدم بڑھایا۔ علاوہ ازیں 'تصویر وفا' میں ایسے موضوعات وعنوانات پر مرثیے ہیں جن موضوعات پر اب تک مرثیے نہیں لکھے گئے تھے جیسے عبداللہ بن عمیر، عبداللہ بن یقطر، بریر بن خضیر ہمدانی، وہب کلبی، مسلم بن عوسجہ، جون حبشی، ہلال بن نافع بجلی، عابس، شوذب، حجاج بن مسروق اور ہاشم بن عقبہ۔ اس طرح فراستؔ نے اس پہلو کے تحت علمی موضوعات کو بہت وسعت دی۔ ''دبستان دبیر'' میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

> ''مرزا اوجؔ نے یہ کوشش بھی شروع کی کہ تاریخ اسلام کے جن واقعات کو مرثیہ گو حضرات عام طور پر نظر انداز کرتے ہیں ان کو بھی مرثیہ میں نظم کیا جائے تاکہ مرثیہ کی شکل میں پوری تاریخ اسلام نظم ہو جائے۔ خود انہوں نے معراج کے حالات میں ایک مرثیہ کہا اور ایک مرثیہ حضرت محمد بن ابوبکر کے حالات نظم کئے ہیں، ان کی اس تحریک سے متاثر ہو کر ان کے شاگردوں نے تاریخ اسلامی کے درجنوں واقعات نظم کر دیئے جن پر قدیمی مرثیہ نگاروں نے کبھی توجہ نہیں کی تھی، گمنام شہدائے کربلا کے حال میں فراستؔ زید پوری کے مراثی اس کا سب سے بڑا نمونہ ہیں'' [۴]

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ فراستؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ منتشر اشاعت رہا۔ مطبوعہ کلام میں (۱) ماہ کامل (اہل بیتؑ کے حالات پر مشتمل دو ہزار بند مسدس کی شکل میں جسے چودہ حصوں پر تقسیم کر دیا ہے) (۲) ماہ تمام (یہ بھی چودہ معصومین کے حالات پر مشتمل چودہ مسدس ہیں) (۳) تصویر وفا (اس میں اصحاب امامؑ پر مشتمل چودہ

Scanned with CamScanner

مرثیے ہیں۔اس میدان میں فراستؔ کو اولیت حاصل ہے)(۴) شہکار فراستؔ (مرتبہ سبط محمد نقوی) منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

فراستؔ کے فن کو اہلِ نظر نے کماحقہٗ سراہا ہے۔علی عباس حسینی مرحوم نے اپنی تصنیف ''اردو مرثیہ'' میں فراستؔ کے کلام سے متعدد مقامات پر استشہاد کیا ہے۔'دبستانِ دبیر' میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے تلامذہ اوجؔ کے ضمن میں اور ڈاکٹر سید سکندر آغا نے اپنی تصنیف ''مرزا محمد اوجؔ: حیات اور کارنامے'' میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ مرزا امیر علی جونپوری اور ڈاکٹر عرفان عباسی نے اپنے تذکروں میں نمایاں جگہ دی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ فراستؔ کے کلام کا بیشتر حصہ منظرِ عام پر نہ آسکا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ فراستؔ کے اخلاف ان کے کلام کی اتنی زبردست نگہداشت کرتے رہے کہ وہ کلام تقریباً نایاب ہوکے بے فیض سا ہوگیا گو اب صورتِ حال بدلی ہے لیکن عام رسائی اب بھی آسان نہیں اس صورتِ حال کا تذکرہ محسنؔ زید پوری نے بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے:

ہے مگر اس لئے بیحد مرا دل رنجیدہ
منظرِ عام پہ کچھ، سب ہے سخن پوشیدہ
مرثیے قید ہیں سب بستوں میں چیدہ چیدہ
کیسے ہو پردہ نشینوں پہ کوئی گرویدہ
مصلحت حق کی اگر ہے تو شتاب اٹھے گی
حسن سب دیکھیں گے جب رخ سے نقاب اٹھے گی

فراستؔ میں مضمون آفرینی کی صلاحیتیں بے پناہ تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی میں بڑا تنوع اور بڑی جدت و شگفتگی پائی جاتی ہے۔ان کے مراثی کا عام انداز یہ ہے کہ وہ کسی ایک علمی مسئلے کو لیتے ہیں اور مرثیہ اس انداز سے مکمل کرتے ہیں کہ وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور مرثیہ کے حدود بھی قائم رہتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کا ایک مرثیہ ہے:

باغ اعجاز کی بوسحر کے جنگل میں نہیں

اس مرثیہ میں انہوں نے اعجاز اور سحر کا فرق نمایاں کیا ہے جو ایک خالص علمی مسئلہ ہے۔ڈاکٹر حسین فاروقی مرحوم لکھا ہے کہ:

> اس مرثیہ کے ہر جزو میں مثلاً رزم کے بیان میں، گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں، آمد اور سراپا میں غرض ہر جگہ وہ اس مسئلہ کو سلجھاتے رہے ہیں اور ہر منزل پر اعجاز اور سحر کے فرق واضح کرتے چلے گئے ہیں۔ان کا یہ انداز بیان دلکش بھی ہے اور مراثی کی معنویت میں بھی زبردست اضافہ کر دیتا ہے۔ ۴۲

فراستؔ نے اپنے مراثی میں کثرت کے ساتھ مسائل علمیہ نظم کئے ہیں۔اس سلسلے میں وہ برابر اجتہادِ فکر کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے ایک ایسا مرثیہ بھی کہا ہے جو تمام تر علم تصوف پر مشتمل ہے اور اس علم کی تمام اصطلاحات بڑی خوبی کے ساتھ مرثیہ میں جمع کر دی گئی ہیں۔یہاں پر اس مرثیہ کے چند بند پیش کئے جارہے ہیں جس سے فراستؔ کے اجتہادِ فکر کے ساتھ ساتھ مرثیہ کے اس رنگ و آہنگ سے بھی واقفیت ہوگی:

سنیں تو دلبرِ پردہ نشیں کے پردہ دار
کریں ریاضِ حقیقت کی سیر عاشقِ زار
بنے محقق طوسی کا علم رنگ بہار
سلوک نام ہے جس کا وہ ہے عجب گلزار
بہت سی ہیں روشیں جن کا ایک مالک ہے
جو کوئی ان روشوں پر چلے وہ سالک ہے
اسی کے بحرِ محبت میں غرق ہیں غواص
وہ باغ جس میں ہیں کانٹے عذاب کے نہ قصاص

سرے پہ اس کے ہے ایمان اک روش ہے یہ خاص
ثبات و نیت و صدق و امانت و اخلاص
اسی شمار میں توبہ کی راہ روشن ہے
وہ زہد و فقر جو اسرار حق کا مخزن ہے
اسی کے ساتھ ریاضت محاسبہ اپنا
مراقبہ کی روش اس کے سامنے تقوا
فضائے عالم خلوت سماں تفکر کا
تفکر ایسی روش ہے کہ دے رہی ہے پتا
جو رنگ صنعتوں کا چرخ تک نرالا ہے
یہ خود بہ خود نہیں کوئی بنانے والا ہے
یہی صفت ہے تفکر کی اور وصف ہو کیا
عجیب لطف ہے سالک ہی جانتا ہے مزا
بڑھا جب ان سے تو آیا مقام خوف و رجا
وہ صبر و شکر کی راہیں وسیع نام خدا
ارادت آگے ہے پھر شوق سے محبت ہے
یقیں ہے بعد یقیں کے سکوں کی حالت ہے
توکل ایک روش ہے پسند عقل سلیم
رہ رضا کے مقابل وہ جادۂ تسلیم
وہ شان منزل توحید و اتحاد عظیم
ہے ان کا خاتمہ وحدت وہ اس کا حسن قدیم
جو کوئی ان روشوں پر چلا تو کیا دیکھا
کھلا ہوا چمن قدرت خدا دیکھا

فراست نے امام حسینؑ کی رخصت کے ذیل میں بھی سلوک و تصوف کی اصطلاحات کا التزام رکھا ہے:

جتا رہے ہیں کہ تسلیم کیا رضا کیا ہے
توکل اس پہ کرو اور آسرا کیا ہے
خدا پرستوں کا ہے امتحاں بلا کیا ہے
خیال اس کا رہے مرضیِ خدا کیا ہے
رہیں گے صدمے اگر شکر کبریا کے ساتھ
حسین بھی بہ خدا ہوگا خوش خدا کے ساتھ
کوئی مشیت خالق سمجھ نہیں سکتا
وہ کام چاہئے انجام جس کا ہو اچھا
یہ ہیں جچی ہوئی باتیں یہی ہے اسکی رضا
عدو اتار لے بھائی کا سر بہن کی ردا
سہولتیں ہیں زمانہ کی سخت گیری میں
کہ ہیں چھپی ہوئی آزادیاں اسیری میں

درج بالا بند میں امام حسینؑ نے اہل حرم کو وصیتیں اور ہدایتیں فرمائی ہیں۔ ذیل کے بند میں فراست نے عشق الٰہی، صبر و رضا اور عرفان و سلوک کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے:

یہ معرفت ہے، یہ اللہ کی محبت ہے
گواہ عشق، غریب الوطن کی رخصت ہے
خدا ہی پر ہے نظر کچھ نہیں عزیزوں کا غم
نہ خوف مرگ نہ افسوس کشتگان ستم
نہ شوق کوثر و طوبیٰ نہ آرزوئے ارم
عزائے قوت بازو نہ بیٹے کا ماتم

Scanned with CamScanner

نہ یہ خیال کہ دریا پہ کس کا لاشا ہے
نہ یہ ملال کہ ریتی پہ کون سوتا ہے

نہ اس کا دھیان کہ بازو ہوا ہے کیوں کر چاک
بھری ہے انگیوں میں کون سی مزار کی خاک
زمیں میں چھپ کے یہ کس نے ہلا دئے افلاک
صغیر کون سا تھا تیر سے ہوا جو ہلاک
بلا کے باغ میں گل کس روش کا پھولا ہے
پڑا ہوا ہے جو خالی یہ کس کا جھولا ہے

فراستؔ نے امام حسینؑ کے کردار، آپ کے صبر اور آپ کی منزل فنا فی اللہ کی کتنی دلآویز تصویر کشی کی ہے جو درج بالا بند سے ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے ''معراج'' کو بھی موضوع بنا کر ایک معرکتہ الآرا مرثیہ کہا:

حجاب شب میں جو روشن چراغ ماہ ہوا
سفید مثل سحر پردۂ سیاہ ہوا
فلک کی سیر سے خوش طائر نگاہ ہوا
عروج پر شب معراج کے گواہ ہوا
زمیں پہ چرخ سے تسبیح کی صدا آئی
نمازیوں کے پھرے دن وہ رات کیا آئی

حشم قدم شہِ لولاک کا نرالا تھا
چراغ راہِ رضا روئے شاہ والا تھا
پروں سے قدسیوں کے منزلوں اجالا تھا
قمر کا مثل نہ تھا بے نظیر ہالا تھا

براق پر رُخ پرنور رضو دکھاتا تھا
چراغ حسن ہوا پر چمکتا جاتا تھا

براق کی رفتار کے لئے محاکاتی انداز بھی بڑا خوبصورت ہے:

نگاہ خلق سے پنہاں رہا ہوا کی طرح
ہوا سے رک نہ سکا نالۂ رسا کی طرح
زمیں سے جانب گردوں چلا دیا کی طرح
بلند ہو گیا تکبیر کی صدا کی طرح
وہ ایک زینۂ قربت تھا شاہ دیں کے لیے
نماز جیسے ہو معراج مومنیں کے لیے

اسی طرح ان کے اجتہادات میں سے ایک ''مرثیۂ جنت البقیع'' بھی ہے جس میں آل سعود کے ہاتھوں جنت البقیع کے روضوں کی مسماری پر مرثیہ پڑھا ہے۔ عاشور کاظمی کے مطابق یہ مرثیہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ عاشور کاظمی نے اپنی تالیف ''اردو مرثیے کا سفر'' میں اس کے تین بند پیش کیے ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

ہے جنت البقیع میں جلوہ بہشت کا
کیا رنگ اس چمن میں ہے دنیائے زشت کا
ملتا ہے لطف گلشن عنبر سرشت کا
عالم فروز نور ہے اک ایک خشت کا
خاتون جنت اس میں جو زیب مزار ہیں
ہر ذرے پر جناں کے جواہر نثار ہیں

محبوب ذوالجلال کو محبوب ہے یہ خاک
قدسی ہیں جس سے خوش، وہ خوش اسلوب ہے یہ خاک
حوریں پکارتی ہیں بہت خوب ہے یہ خاک

Scanned with CamScanner

غازہ بنانے کے لیے مرغوب ہے یہ خاک
صحن لطیف غیرت دامان طور ہے
حیراں ہے آفتاب وہ مٹی میں نور ہے
بدخواہ کیا مٹائیں گے اس باغ کی نمود
اس کا جو باغباں ہے وہ ہے واجب الوجود
نکہت وہ ہے کہ جس سے عیاں قدرتِ ودود
اہل بہشت آتے ہیں پڑھتے ہوئے درود
کیا اصل ہے کسی چمنستاں کے پھول کی
اس خاک سے تو آتی ہے خوشبو رسولؐ کی

فراستؔ نے اپنے مرثیوں میں موضوعات کی وسعت اور تنوع مضامین کی جھلک جگہ جگہ پیش کی ہے۔ مامون رشید عباسی خلیفہ کے عہد میں قحط پڑا۔ ساری زراعتیں اور کل باغ وچمن خشک ہوگئے۔ اس کیفیت کو فراستؔ نے امام ہشتم کے مرثیے میں بیان کی ہے:

پانی کی ایک بوند بوند کو مٹی ترستی تھی
گلزار وکوہ ودشت پہ حسرت برستی تھی

مامون رشید نے امام رضاؑ سے کہا کہ لوگ طعنے دیتے ہیں کہ چونکہ میں نے اس سال آپ کو اپنا ولی عہد بنایا ہے، اس لئے ملک پر یہ بلا نازل ہوئی ع۔

آپس میں ذکر ہے نہ مبارک ہوا یہ سال

اس لیے آپ خدا سے باران رحمت کے لیے دعا فرمائیں۔ امام مع مامون رشید اور درباریوں کے ایک صحرا میں تشریف لے گئے اور آپ نے بارش کے لیے دست دعا بلند کیا:

مشغول تھے دعا میں ابھی شاہ ارجمند
جو پارۂ ہائے ابر ہوا پر ہوئے بلند

آہو کی طرح بھرنے لگیں بجلیاں زغند
چشمک تھی ان کی چشم فسوں ساز کو پسند
بڑھتا گیا سرور وہ ٹھنڈک ہوا کو تھی
کالی گھٹا کے پردے میں رحمت خدا کی تھی
لشکر وہ ابر کا وہ نقیبانہ بانگ رعد
کالی گھٹا پہ صدقے ہو لیلائے شب کی جعد
بد ساعتیں گزر گئیں آ پہنچا وقت سعد
گھر گھر بنائے عیش وطرب حسرتوں کے بعد
کرتی تھی خلق خالق ارض وسما کا شکر
جاری زبان پہ آب، زباں پر خدا کا شکر
ذروں کی آنکھیں دیکھتی تھیں شان کردگار
حیراں تھا صحن باغ میں بیٹھا ہوا غبار
کیا نہروں کی امنگ تھی، کیا جوش آبشار
فوارے مست، اٹھتی جوانی کی وہ بہار
تھی دھوم عالم اور چمن کی فضا کا ہے
جو کچھ ہے سب یہ رنگ دعائے رضا کا ہے

فراستؔ زید پوری نے الگ الگ موضوعات پر اجتہادات کیے ہیں۔ ''اردو مرثیہ'' میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ:

''فراستؔ زید پوری شاگرد مرزا اوجؔ نے چہاردہ معصومین کے جوالگ الگ مرثیہ کہے ہیں اور جن کے مجموعے کا نام ''ماہ کامل'' رکھا ہے ان میں سے ایک میں جو حضرت علی ابن ابیطالب کی جنگوں سے متعلق ہے۔ جنگ لیلۃ الہریر کی بھی بڑی کامیاب مرقع کشی کی ہے''۔ ۴۳

Scanned with CamScanner

فراست کی اس کامیاب مرقع کشی کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں جس میں لیلۃ الحریر کی صفات وخصوصیات بیان کی گئی ہیں:

سرگرم حرب وضرب تھی افواج کی بہیر
پر آخری لڑائی میں گھبرا گئے شریر
رن میں تمام رات رہا شوردار وگیر
کہتے ہیں جس کو معرکۂ لیلۃ الہریر

پوشیدہ شکل راحت وآرام ہوگئی
حملے سحر سے ہونے لگے شام ہوگئی

دوش فلک سے گرگئی خورشید کی سپر
تیغیں بہادروں کی رہیں رن میں جلوہ گر
مرتے تھے بانکپن پہ جوانان پُرجگر
کچھ خوف جاں نہ ظلمت شب کی طرف نظر

تلوار چل رہی تھی کنارے فرات کے
ڈھالوں پہ یہ گماں کہ ہوئے ٹکڑے رات کے

خوں ریز مثل چشم فوں ساز تھی وہ شب
گیسوئے مہوشاں کی طرح ڈھاتی تھی غضب
صحرائے ہولناک میں ہنگامہ تھا عجب
رن بولتا تھا، ساکن دریا تھے جاں بلب

اڑتی تھی خاک مرغ ہوا بے حواس تھے
ذرے بلند ہو کے ستاروں کے پاس تھے

قہر الٰہ تھا شب محشر نما کا طول
غل وحشیوں میں تھا کہ بلا کا ہوا نزول

طائر ہوائے تند کے جھونکوں سے تھے ملول
جگنو شجر سے گرتے تھے جیسے خزاں میں پھول

برباد برق خوف سے آب رواں ہوا
سبزے پہ تیرگی میں دھواں کا گماں ہوا

دنیا سیاہ کاروں کی آنکھوں میں تھی سیاہ
ظلمت میں سرمہ گوں ہوئے تھے رشتۂ نگاہ
ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ اللہ کی پناہ
صرصر سے حال دشت پر آشوب تھا تباہ

موج ہوا تھی کاہے کو مجنوں کی آہ تھی
وہ رات مثل گیسوئے لیلیٰ سیاہ تھی

لیلۃ الہریر کی اس قیامت خیز رات میں جنگ کی منظر کشی اور اس منظر نامہ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کے گھوڑے ریاح کی خصوصیات اور اس کی برق رفتاری قابل دید ہے:

لو آفتاب دیں کی سواری عیاں ہوئی
جنگل میں روشنی ہوئی ظلمت نہاں ہوئی
طوفان غم میں غرق سیاہ گراں ہوئی
دریائے خوں میں تیغ کی کشتی رواں ہوئی

اسپ وسوار غرق محیط فنا ہوئے
دست خدا کے وار سے بے دست وپا ہوئے

قبضہ میں ذوالفقار ظفر پر تھا دسترس
گھوڑا اڑا ہوا میں تو گھبرائے بوالہوس
نام اس کا تھا ریاح، صبا کا تھا ہم نفس
تھا مرسل الریاح کے محبوب کا فرس

قرب علیؑ سے زین کا رتبہ بلند تھا
یہ جس کے جانشین تھے اس کا سمند تھا

اسی طرح فراستؔ نے امام علی نقی علیہ السلام کے مرثیے میں جب عباسی بادشاہ متوکل امام کو اپنی کثرت فوج دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ وہ مدعی ہے کہ آپ نے ایسی سپاہ نہ دیکھی ہوگی۔ حضرت نے اس کے جواب میں اسے اپنا لشکر دکھایا۔ فراست سے اس عسکر قہار کا حال سنئے اور حسنِ نظم کی داد دیجئے:

پوری نہ مدح ہو جو لکھے عمر بھر قلم
اک ضرب سرسری سے ہوں لاکھوں کے سر قلم
ہر وار میں ہوں دشت کے صد ہا شجر قلم
کوہ گراں کے سنگ ہوں زیر و زبر قلم
تیغوں سے مثل خود و سپر آسماں کٹیں
وہ برق دم کہ ابر میں کیا بجلیاں کٹیں

گھوڑے وہ زیر ران کہ بیخود سوار ہیں
سب اپنے آپ کے لیے فصل بہار ہیں
سرعت کا ہے یہ دشت حدیں جسکی پار ہیں
سعدین و نیرین سموں پر نثار ہیں
ہے قدرتی بناؤ خدا کا رساز ہے
ناز و ادا کو صورت و سیرت پہ ناز ہے

کیا فوج قاہرہ ہے زہے شوکت و حشم
وہ ہمہمے، وہ نعرۂ تکبیر دم بدم
دنیا کے جن و انس و بہائم جو ہوں بہم
اس نور کی بہیر سے تعداد میں ہوں کم

ہے سلسلہ کہاں سے کہاں تک پتہ نہیں
مثل ثواب نصرت دیں انتہا نہیں

ہے ان کے سامنے کسی لشکر کی اصل کیا
شور و نشور فتنۂ محشر کی اصل کیا
طوفاں کی کیا بساط ہے صرصر کی اصل کیا
پانی کا جوش کیا ہے، سمندر کی اصل کیا
آندھی کو زلزلے کو اشارے سے روک دیں
بحر رواں کو تیغوں کی دھاروں سے روک دیں

علی عباس حسینی مرحوم رقم طراز ہیں:

''فراست زید پوری نے بعض ائمہ کا حلیہ بیان کرنے میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے بیان سے ہمارے سامنے ایک پوری تصویر آجاتی ہے۔ جس پر اکثر مرثیہ گویوں کی زیادتی تشبیہات واستعارات نے پردہ سا ڈال رکھا ہے''۔ ۴۴

علی عباس حسینی کے اس قول کی روشنی میں فراستؔ کے مجموعہ ''ماہ کامل'' سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا حلیۂ مبارک ملاحظہ ہو۔ اس حلیہ کے بیان کرتے وقت نہ صرف امام کا حلیہ بیان کرنا مقصود ہے بلکہ اسلامی اخلاقیات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے:

حلیہ امام دیں کا سنیں صاحب شعور
ہاں چشم دل زیارت شہ میں نہ ہو قصور
وہ قد میانہ، رنگ وہ گورا، وہ رُخ کا نور
بے انتہا سپاہ تھے موئے سرِ حضور
گھونگھر پڑے تھے زلف میں چہرے پہ خال تھے
گویا وہ خال نقطۂ جیم و جمال تھے

Scanned with CamScanner

وہ بنی کشیدہ و باریک ضوفشاں
باریک بیں تھے جس کی ستائش میں یکزباں
اُبھرا ہوا تھا بیچ میں بنی کا استخواں
کس منہ سے اس ابھار کی تعریف ہو بیاں
نازاں تھا حسن قدرتِ پروردگار پر
عاشق کے دل کا جوش فدا اس اُبھار پر

شارب زیادہ واضح و روشن ہلال سے
دو ڈورے تن پہ سُرخ تھے خوش رنگ لال سے
انصاف خوش نہیں رگ گل کی مثال سے
واقف ہو کون صنعت خالق کے حال سے
صدقے ہو فکر شاعر نازک خیال کی
سُرخی وہ تھی صحیفۂ حسن و جمال کی

ریش سیہ تھی عہد جوانی میں خوش نما
چہرے کے ضو سے تھی شب مہتاب کی فضا
پیری کی صبح کا جو سفیدہ نظر پڑا
بھایا خضاب برگِ حنا گہرے رنگ کا
وہ ریش سرخ وہ رخ انور جناب کا
تھا مسند شفق پہ جلوس آفتاب کا

اسی مرثیے سے صادق آل محمد امام جعفر صادق کی سیرت ملاحظہ فرمائیں جن میں فراست نے دو چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان میں جو سادگی برتی ہے وہ فنکاری کی بہترین مثال ہے:

راضی قضا پہ تھا وہ جگر بند مرتضیٰ
کرتا ہے ایک شخص یہ وصفِ شہِ ہدا

بیمار کوئی آپ کا تھا طفل مہ لقا
دولت سرا پہ اس کی عیادت کو میں گیا
حضرت کھڑے ہوئے تھے جھکا میں سلام کو
پایا مگر اُداس امامِ انام کو

اندر گئے حضور میں ٹھہرا رہا وہیں
دیکھا یہ واپسی میں کہ غم کا اثر نہیں
میں نے کہا کہ شاد رکھے رب العالمیں
شہزادہ خیریت سے ہے اے بادشاہ دیں
فرمایا وہ مریض جہاں سے گزر گیا
لڑکے کا حال دیکھ کے آیا ہوں مر گیا

پوچھا کہ پہلے رنج تھا اب کیوں نہیں ملال
بولے ہم اہلبیت نبیؐ کا یہی ہے حال
غم کا دم نزول بلا کرتے ہیں خیال
نازل وہ ہو گئی تو کیا شکر ذوالجلال
تسلیم کس طرح نہ رضا کبریا کی ہو
بندے کا دخل کیا جو مشیت خدا کی ہو

اک نقل اور صبر و تحمل پہ ہے گواہ
پایا ملول شہ کو جو راوی نے کی نگاہ
پوچھا کہ خیریت تو ہے اے شاہِ دیں پناہ
فرمایا روک دی تھی بلندی کی میں نے راہ
تاکید کی تھی حد سے نہ ہرگز بڑھا کرے
بالائے بام گھر میں نہ کوئی چڑھا کرے

Scanned with CamScanner

بچے کی پرورش پہ مقرر تھی ایک زن
میری کنیز ہے، نہ مگر مانا وہ سخن
کوٹھے پہ چڑھ رہی تھی کہ پہنچا میں دفعتاً
آغوش میں تھا طفل، لرزنے لگا بدن
دیکھا مجھے تو خوف سے گھبرا گئی کنیز
گودی سے طفل چھٹ گیا، تھرا گئی کنیز
گرتے ہی مر گیا وہ مرا پارۂ جگر
کچھ اس کی موت کا مرے دل پر نہیں اثر
یہ رنج ہے کہ ڈر گئی وہ مجھ کو دیکھ کر
کیوں میرا اتنا رعب ہوا اس کنیز پر
ظاہر یہ کہہ کے لطف خداداد کر دیا
آواز دی کہ جا تجھے آزاد کر دیا

فراستؔ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے:

"فراستؔ مرحوم نے اپنی کاوشوں کے نتیجے میں زید پور میں ایک اچھا خاصا ادبی وشعری ماحول پیدا کر دیا تھا جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں اور شاگردان فراستؔ کی بدولت آج بھی زید پور میں مرثیہ گوئی کا چلن قائم ہے"۔ ۴۵

فراستؔ نے ۲۷ر صفر ۱۳۷۲ھ کو انتقال کیا۔ اس طرح زید پور میں بزم ادب کو منور کرنے والا شاعر اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک قافلہ بھی چھوڑ گیا جن میں مشہور مرثیہ گو سید سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی، خورشید حسن مہرؔ، غلام عباس ناصرؔ زید پوری، سید محمد محسنؔ زید پوری، ابن حسن حسنؔ زید پوری، مولانا محمد باقر جوراسی، نفاست حسین نفاستؔ، فائز حسین فائزؔ، سید محمد عارجؔ اور مودت حسین مودتؔ زید پوری اہمیت کے حامل ہیں۔ فراستؔ کی مجلس چہلم میں ۳۶ قطعات تاریخ پڑھے گئے۔ ایک قطعۂ تاریخ کا مادہ درج ہے۔ ع جہاں بے نور منبر بے فراستؔ (۱۳۷۲ھ)۔

یونس حسین یونسؔ

مرزا محمد اوجؔ کے دوسرے اہم شاگرد جنہوں نے دبستان زید پور کو نمایاں کیا وہ یونسؔ زید پوری ہیں۔ انہوں نے ایک بیت میں اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

مثل مصیب سالک راہ صواب ہوں
مداح آل پاک رسالت مآب ہوں

سید یونس حسین (۱۵ر شعبان ۱۲۸۸ھ۔ ۲۱ر رمضان ۱۳۷۷ھ مطابق ۳۰ر اکتوبر ۱۸۷۱ء۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۵۸ء) کے والد مولانا مونس حسین مصیبؔ ایک عالم جلیل اور اچھے مرثیہ گو تھے۔ جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مولانا ریاست حسین زید پوری سے حاصل کی۔ مڈل تک ہی تعلیمی سلسلہ رہا۔ ایک اوسط درجے کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود یونسؔ کو دیگر معاشی ذرائع کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ ابتدا میں کچھ دنوں تعلقدار کردہا ضلع اناؤ (اتر پردیش) اور اس کے بعد میر بنیاد حسین تعلقدار زید پور کے یہاں اتالیق رہے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۷ء تک ہیوٹ روڈ اور مقبول گنج لکھنؤ کے اسکولوں میں مدرس رہے۔ پنشن یاب ہو کر شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ کے مدرسہ میں معلم رہے۔ ان حالات میں بھی شاعری ترک نہیں کی بلکہ ادب کی خدمت کرتے رہے:

شعر کہنے کے لئے یونسؔ فراغت چاہیے
کیا کہوں فرصت نہیں ملتی مجھے افکار سے

Scanned with CamScanner

شاعری میں مرزا اوج اور علی میاں کامل کے شاگرد تھے۔ قادر الکلام اساتذہ کی رہنمائی نے انہیں بہت جلد شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا اور یونس بحیثیت مرثیہ نگار اور تاریخ گو کے مشہور ہو گئے۔ یونس قادر الکلام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلم الثبوت استاد بھی ہیں۔ انہوں نے ایک جماعت کی تربیت کی جس نے ادب کی خدمت کی۔ ان کے شاگردوں میں اکمل اور محسن نے کامیاب مرثیے کہے۔ نصیری اور شاد کے قصیدے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ خادم اور خاتون نوحہ نگاری میں ممتاز ہیں۔ سخنور اور منتصر ہر شعبے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں محسن، سخنور اور منتصر نے اچھی تاریخیں کہی ہیں۔ ان کے ایک شاگرد سردار مہدی نے نثری خدمات بھی کی ہیں۔

یونس اپنے عہد کی جانی پہچانی شخصیت تھے جن کے کمال شاعری اور عظمت تاریخ گوئی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی انہیں بھلا دیا گیا۔ صرف ''دبستان دبیر'' اور ''اوج لکھنوی حیات اور کارنامہ'' میں ان کی شاعری کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عرفان عباسی نے اپنے تذکرے میں یونس کی استادانہ حیثیت کا اعتراف کیا ہے اور مولانا فرید مہدی رضوی نے ان پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یونس کے فن پر کماحقہٗ کام نہیں ہو سکا۔ یونس کا خاص میدان تاریخ گوئی تھا جو کافی ریاض چاہتا ہے۔ ان عوامل کے پیش نظر یونس کا جو بھی نام ہے وہ ان کے فن کا اعجاز ہے۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں اپنی استادی کو تسلیم کرا لیا ہے لیکن ہر جگہ مدح اہلبیتؑ کا عنصر غالب رہا:

مدح و ثنا ائمہ کی ہے یونس اور ہم　　دنیا بھی اپنی وہ ہے کہ عقبیٰ کہیں جسے

اور مداحی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہیں ایک استاد کی حیثیت سے محترم مانا جاتا تھا جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے ع

جانتے ہیں مجھے صغار و کبار

دوسری جگہ کہتے ہیں:

دن رات جو ایک ایک سے جھک جھک کے نہ ملتا
یونس یہ ترا اوج یہ توقیر نہ ہوتی

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہاں کے سربرآوردہ اور قابل فخر شاعروں میں مرحوم یونس زیدپوری بھی تھے جنکی گمنامی اور شاعرانہ برتری ایک دوسرے کا جواب ہیں'' ۴۶

یونس زیدپوری نے ساری عمر تعلیم و تعلم اور مداحی اہلبیت میں بسر کی، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، سلام، نوحہ، مرثیہ غرض سبھی کچھ کہا لیکن زمانہ کی دستبرد کے ہاتھوں سارا سرمایہ کلام تلف ہو گیا لیکن جو کچھ مراثی بچ رہے اسے ڈاکٹر ای۔ اے حیدری نے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے اور اس طرح اس عظیم مرثیہ گو کے مراثی محفوظ ہو گئے ہیں۔ ان کی تاریخیں بھی برادر محترم جناب سید محمد رضا عابد (جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا) جو یونس کی نواسی رضیہ الزہرا مرحومہ کے صاحبزادے ہیں ''نقش بقا'' کے نام سے مرتب کر دی ہیں اور ہنوز منتظر اشاعت ہیں۔

یونس اور فراست اوج کے ایسے شاگرد ہیں جو فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ بیحد زود گو بھی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں زیدپور میں میر غلام عباس صاحب کے تعزیہ سے پانی جاری ہو گیا اور اس معجزہ کی سارے صوبہ میں دھوم مچ گئی۔ چنانچہ اطراف کے ہزاروں لوگ اس معجزہ کی زیارت کے لیے زیدپور میں جمع ہو گئے۔ اس امامباڑہ میں روزانہ مجلس ہونے لگیں۔ یونس اور فراست روزانہ شب کو نیا مرثیہ کہتے اور دن میں یہی نو تصنیف مرثیہ پڑھتے۔ چنانچہ دس دن میں یونس نے دس نئے مرثیے کہے جو ان کی زود گوئی، پر گوئی اور مشاقی کی ایک محکم دلیل ہے۔ اس موقع کی چند رباعیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

جو منکر اعجاز ہیں کب انساں ہیں　　غافل جو امام سے ہیں بے ایماں ہیں
اعجاز و امام ربط رکھتے ہیں بہم　　دونوں کے عدد بھی قدرتاً یکساں ہیں

☆☆☆

Scanned with CamScanner

تیرا کرم اے علیؑ کے جانی دیکھا سنتے تھے جو اوروں کی زبانی دیکھا
اے بادشہِ تشنہ دہاں صد ہانے جاری ترے تعزیہ سے پانی دیکھا

☆☆☆

ہیں میری ریاضت پہ مہ و سال گواہ دن رات گواہ واقف حال گواہ
یہ مرثیہ اک شب میں ہے تصنیف کیا شمع و قلم و کاتبِ اعمال گواہ

☆☆☆

یہ تعزیہ فیض کی نشانی نکلا چشمہ پئے جوشِ مدح خوانی نکلا
یہ مرثیہ میری آبرو کا ہے سبب پڑھتا تھا کہ تعزیہ سے پانی نکلا

اسی سلسلے کے ایک مرثیہ میں رات کے وقت مرثیہ نظم کرنے کی کیفیت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

ہنگام شب ہے نظم ہے اس وقت کی بہار
اک جا حواس خمسہ ہیں اب کیا ہے انتشار
سو کر اٹھا ہے نیند کا آنکھوں میں ہے خمار
ساقیٔ تشنہ لب کو مدد کے لیے پکار
یہ تشنہ کام وہ ہے جو دریا نوال ہے
بحرِ کرم ہے ساقیِ کوثر کا لال ہے
سیراب کر چکا ہے تجھے وہ یمِ کرم
بخشی ہے آبرو وہ کبھی جو نہ ہوگی کم
جاری ہے فیض پیاسے کا میخوار ہیں بہم
تیری طرح سے جھومتے ہیں وہ بھی دمبدم
ساقی کا وصف کرتے ہیں پیہم سرور میں
آئے ہیں دور دور سے سب زید پور میں

یہ تعزیہ ہے چشمۂ فیضِ امام دیں
کوثر سے بڑھ کے جانتے ہیں جسکو با یقیں
تو اس کا ہے پیالہ پئے اس میں شک نہیں
کر یاد تشنگیِ حسینؑ اور ہو حزیں
جو اجر جاگنے میں ہے وہ کب ہے سونے میں
مانندِ شمع رات بسر کر دے رونے میں

یونسؔ نے اپنے مرثیوں سے اصلاح اور تزکیۂ نفس کا کام لیا ہے۔ اپنے ایک مرثیے میں شباب کی تعریف کرتے کرتے نوجوانوں کو طاعت و عبادت کا سبق دیا ہے:

ہشیار اے جواں کہ جوانی ہے کوئی دم
افسانہ حسرتوں کا دراز اور رات کم
قصوں کو چھوڑ، واں کے لیے کر لے کچھ بہم
سامان سب ہیں جمع یہ موقع ہے مغتنم
غفلت میں خاص وقت یہ کھونا نہ چاہئے
یہ رات جاگنے کی ہے سونا نہ چاہئے

اخلاقیات کی تعلیم اور تزکیۂ نفس کی ہدایت یونس کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے مراثی میں زاہدانہ خشکی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے پائی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اعتراف کیا ہے کہ:

''کلام میں تازگی، شگفتگی اور تاثیر کے جوہر قدم قدم پر نمایاں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نصیحت بار خاطر نہیں ہوتیں، کلیجہ میں اترتی چلی جاتی ہیں'' [۷۴]

یونس کے مرثیوں میں حسن بیان اور معنی آفرینی کا عنصر بھی بخوبی ملتا ہے۔ ایک مرثیہ میں جناب رسولؐ خدا اور جناب یوسفؑ کے حسن کا موازنہ کیا ہے، حسن یوسفؑ کے

Scanned with CamScanner

تعلق سے کہتے ہیں:

وہ حسن اور حضرت یوسفؑ کا وہ شباب
قربان تھے نثار تھے دن رات شیخ و شاب
یکتا تھے بے نظیر تھے، بے مثل تھے جناب
کوکب سحر کو، شب کو قمر، دن کو آفتاب
ہر وقت ضوفگن رُخ زیبا تھا آپ کا
گم کر رہا تھا ہوش وہ جلوہ تھا آپ کا

یہاں پر یونس نے حدیث قدسی لولاک لما خلقت الافلاک سے استفادہ کرتے ہوئے حسن رسالتمآبؐ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

یہ سب سماں جہاں میں ہے ذات جناب سے
روشن ہے مہر نور رسالتمآب سے
مہتاب کا چراغ جلا آفتاب سے
پرتو فگن نجوم ہوئے ماہتاب سے
جلوہ کہاں کہاں نہیں حضرت کے نور کا
قربان میں یہ سب ہے تصدق حضور کا

گویا اگر یوسف شمس و قمر ہیں تو حضرت ختمی مرتبت باعث تخلیق شمس و قمر ہیں۔ اس لئے حسن حضرت ختمی مرتبت اور حسن حضرت یوسف کا مقابلہ ہی فضول ہے۔

یونس زید پوری بنیادی طور پر رعایت لفظی کے شاعر ہیں لیکن ساتھ ہی معنی آفرینی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ یونس کے عہد تک زندگی کے معاشرتی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کی ترجمانی مرثیہ کا جزو بن چکی تھی۔ یونس اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اسی لئے انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے مرثیوں میں پیش کیا۔ اخلاقی اقدار کی بحالی کے

ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ کو فرض عین سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب ان کی مذہب سے زبردست وابستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوان کی بے راہ روی پر بے چین ہو جاتے ہیں اور انہیں مخاطب کرتے ہیں:

اٹھ فرش خواب سے سوئے سجادہ ہو رواں
کھول آنکھیں دیکھ شان خداوند انس و جاں
غافل اگر ہے کان لگا ہوتی ہے اذاں
پس سن کے لفظ لفظ ادا کر وہ بعد ازاں
پہلے ہے کام کان کا پھر ہے زبان کا
اقرار عضو عضو سے کر اس کی شان کا

آگاہ ہو نماز کا ہے وقت اول اب
مالک کا نام لینے سے غافل ہے کوئی کب
مصروف ہیں طیور بھی حمد خدا میں سب
کرتے ہیں اپنی اپنی زباں میں ثنائے رب
ظاہر میں چپ ہیں یاد خدا میں شجر بھی ہیں
مشغول مدح اپنی جگہ پر حجر بھی ہیں

غافل اگر ملے گا تو انساں ہی شک نہیں
ایسے بشر کے پاس نہ جائیں گے دور ہیں
آنکھیں ہیں سوجھتی نہیں لیکن رہ یقیں
ہیں کان بھی مگر نہیں سنتا رموز دیں
غفلت پہ غفلت اس کی عیاں ہے بیان کیا
اس کو خبر سحر کی نہیں ہے، اذان کیا

یونس نے اپنے مرثیوں کے اندر اخلاقیات کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی

Scanned with CamScanner

غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ وہ عمل خیر کی طرف ملتفت ہو جائے:

اللہ اکبر اس پر بھی ہے حق کا یہ کرم
دیتا ہے رزق صدقے اس انعام رب پہ ہم
کیا بندہ پروری ہے زہے رحمت اتم
عاجز زباں بیان میں ہے لکھنے میں قلم
یوں پیش آرہا ہے وہ کیا اس کو کہتے ہیں
کچھ شک نہیں خطا پہ عطا اس کو کہتے ہیں

اور اسی لیے یونس اپنے مرثیوں میں مایوسی کی بات نہیں کرتے اس لیے کہ ان کے پیش نظر قرآن کی آیت لا تقنطو من رحمة الله ہے اور جب مایوسی جائز نہیں اور در توبہ وا ہے تو کسی بھی وقت توبہ کر کے رحمت خداوندی حاصل کی جاسکتی ہے:

باب توبہ ہے کھلا بہر بشر تا دم مرگ
دل میں رحمت کے یہ کرسکتا ہے گھر تا دم مرگ
حیف ہے حیف نہ تائب ہوا گر تا دم مرگ
اس کی جانب سے یہ موقع ہے مگر تا دم مرگ
وہ نہیں چاہتا ہے کوئی گنہگار اُٹھے
جو اٹھے خلق سے وہ پاک وسبکسار اُٹھے

یونس کے مراثی میں بین اور شہادت کا بیان بہت دردناک اور پر تاثیر ہوتا ہے لیکن منافی صبر حکایات اور وضعی روایات سے پرہیز کیا ہے۔ صحیح اور سچے واقعات کو الفاظ اور انداز بیان کے سہارے نہایت مبکی انداز میں پیش کیا ہے جس کی مثال اردو کی دوسری اصناف میں کم دکھائی دیتی ہے:

تنہا اٹھانا لاش ہے ہر طرح سے محال
کس کو پکارے بہر مدد فاطمہ کا لال

ابن حسن بھی ہو چکا میداں میں پائمال
بے دست ہو گیا اسد شیر ذوالجلال
سب کام آچکے ہیں، جواں ہیں نہ پیر ہیں
باہر ہیں آپ خیمے میں یا کچھ صغیر ہیں
ظاہر ہے یہ کوئی بھی نہیں حامی ومعین
مایوس ہر طرف سے ہے زہرا کا مہ جبیں
کیا فکر اور کرتے امام فلک نشیں
اطفال کو پکارے بآواز ودل خریں
آؤ اٹھاؤ اپنے برادر کی لاش کو
سب مل کے لے چلو حسد پاش پاش کو
ماتم سرا سے بچوں کا آنا میں کیا کہوں
مل کر جواں کی لاش اٹھانا میں کیا کہوں
میت کا خیمہ گاہ میں لانا میں کیا کہوں
آل نبی کا اشک بہانا میں کیا کہوں
مشغول گھر کا گھر تھا منہا اشکوں سے دھونے میں
خرد وبزرگ سب تھے ہم آواز رونے میں

یونس کا بیشتر کلام تلف ہو چکا ہے لیکن جو کچھ بچ رہا ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور وہ اپنے وقت کے استاد ان فن میں شمار کیے جاتے تھے۔

یونس نے جمعہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ/ ۱۱ اپریل ۱۹۵۸ء کو وفات پائی اور کربلائے ملکہ جہاں عیش باغ لکھنؤ میں دفن ہوئے ان کے شاگرد محسن زید پوری نے تاریخ کہی:

رفت استاد وا تا لیقم بگلزار جناں
یافت قرب شاہ دیں باصد حشم یونس حسین

Scanned with CamScanner

نظم من افسوس از اصلاح او محروم شد
اہل علم، اہل سخن، اہل قلم یونس حسین
محسن ایں تاریخ ہجرش درسن ہجری نوشت
رہبر فن مجلس آرائے ارم یونس حسین

۱۳۷۷ھ

یونس کثیر التلامذہ استاد تھے ان کے چند اہم شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) مفوض حسین نصیری (۲) اکمل زید پوری (۳) سخنور زید پوری
(۴) معصومہ خاتون زید پوری (۵) محمد شاد، شاد زید پوری (۶) محسن زید پوری
(۷) سید خادم عباس خادم (۸) منتصر زید پوری

مبشر حسین سخنور

دبستان زید پور میں اب وہ دور آتا ہے جس میں شاگردان یونس و فراست نے دبستان زید پور کو سنوارنے میں اہم رول ادا کیا اس عہد کے مشہور شعرا میں نصیری، اکمل سخنور، حسن، شاد، خادم، ناصر، نفاست، فائز، عارف، حسن، سخنور زید پوری، منتصر، خاتون، کنیز فاطمہ اور مودت زید پوری اہمیت کے حامل ہیں۔

سخنور زید پوری (۸۴-۱۸۸۳ء تا ۱۹۳۰ء) یونس کے ساتھ ساتھ اوج کے بھی شاگرد ہیں۔ ان کا مرتبہ شاگردان اوج میں اسی طرح ہے جس طرح مشیر کا شاگردان دبیر میں۔ انہوں نے ہر شیہ میں اصلاح کی اور فحاشی ختم کر کے ہر شیہ کو شستہ اور پاکیزہ مزاج کا آئینہ دار بنا دیا اور اس میں خالص علمی و دینی مضامین داخل کیے۔ انہوں نے مشیر کی تقلید کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی۔ غزل گوئی اور قصیدہ گوئی میں خاص مقام ہے۔ آٹھ مرتبہ عتبات عالیات کی زیارت کو گئے۔ ان کا سارا کا سارا کلام تلف ہو گیا جو کچھ ہے وہ تذکروں ہی میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''سخنور نے ہر شیہ کو پاکیزہ اور لطیف مزاج کا آئینہ دار بنایا''۔ ۴۸

سخنور کے کلام کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے ہر شیوں میں متین، سنجیدہ اور عالمانہ فضا پیش کی ہے۔ سخنور کے ہر شیہ میں مدح کے پہلو

Scanned with CamScanner

ملاحظہ فرمائیں:

وہ ذوالفقار جو ہندی نہ اصفہانی تیغ
وہ ذوالفقار زمیں پر جو آسمانی تیغ
وہ ذوالفقار زباں زد جو آسمانی تیغ
وہ ذوالفقار جو اس گھر کی خاندانی تیغ

وغا میں پنجۂ مشکل کشا میں رہتی تھی
وغا کے بعد یہ عصمت سرا میں رہتی تھی

امیر المومنین علیہ السلام کا خیبر میں جہاد بھی قابل دید ہے:

نہ اگر بہر ثنا کوئی زباں کھولے گا
آپ کی ضرب کی تعریف میں رن بولے گا

حشر تک یاد رہے گا شہِ صفدر کا جہاد
خاص ہے عام نہیں خاصۂ داور کا جہاد
بھول جائے کوئی ایسا نہیں صفدر کا جہاد
وہ احد کا ہو کہ خندق کا کہ خیبر کا جہاد

جانفشانی علیؑ سرورِ دیں سے پوچھو
ضرب کا حال پر روح امیں سے پوچھو

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی رقمطراز ہیں کہ:

''سخنورؔ نے مرثیہ کبھی نہیں کہا، صرف قصائد، سلام اور ہر ثیہ کہتے تھے۔ ہر ثیہ پر وہ کسی سے اصلاح نہیں لیتے تھے، قصیدہ اور سلام پر مرزا اوجؔ سے اصلاح لیتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی یوسؔ زید پوری کو کلام دکھانے لگے تھے، ہر ثیہ پر ان سے بھی اصلاح نہیں لیتے تھے بلکہ اس معاملہ میں خود اپنے ذوق پر بھروسہ کرتے تھے''۔ ۴۹

سخنورؔ کے ایک نعتیہ مسدس کے چند بند 'العلم' ممبئی کے ''نعت خیر المرسلین'' ۵۰ نمبر میں شائع ہوئے ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

محبوب ذوالجلال رسولِ فلک حشم
جن پر درود بھیجتا ہے رب ذوالکرم
جن کا کلام وحی خدا، ایسے محترم
الفت ہے جن کی آل کی واجب ہر ایک دم
منکر جو اس طبیب کا ہو روسیاہ ہے
دستِ شفا پہ مہرِ نبوت گواہ ہے

ختم الرسل جہاں میں ہے شاہ فلک جناب
نازل خدا نے آپ پہ کی آخری کتاب
وہ آخری کتاب کہ جس کا نہیں جواب
بالا ہے سب کتابوں پہ یہ فرد انتخاب
تو قیر کیسی پائی رسولِ کریم نے
قرآن یا سند یہ عطا کی حکیم نے

ہر درد لا دوا کی دوا ہے مرا طبیب
سارا جہاں مریض شفا ہے مرا طبیب
عیسیٰ سے مرتبہ میں سوا ہے مرا طبیب
چوتھے فلک سے آگے گیا ہے مرا طبیب
عیسیٰ کبھی گئے نہیں عرشِ عظیم تک
پہنچا مرا طبیب حکیم قدیم تک

ایسی سند کہ مانی فصیحوں نے مستند
کوئی بلیغ آج تلک کر سکا نہ رد

Scanned with CamScanner

ہے پاس کس طبیب کے یہ مخزن صمد
ہے فیض جس کی ذات کا یہ روح یہ جسد
روحانیوں میں شور ہے اس کے جلوس کا
پایا خطاب خاص طبیب نفوس کا

الحق ہوا ہے فخرِ مسیحا مرا طبیب
ہر دو جہاں میں فرد ہے یکتا مرا طبیب
ہے اوج میں مسیح سے بالا مرا طبیب
قرآں کا ایک نسخہ جو لایا مرا طبیب
جس کے ہر ایک جز میں شفا بے قیاس ہے
خالق کی کلیات محمدؐ کے پاس ہے

دست شفا خطاب، سند مہر لا کلام
کیا کیا کیا نہیں ید قدرت نے انتظام
اللہ رے اقتدار ہے عز و احتشام
بھیجا خدا نے آپ درود ان پہ اور سلام
ان کی ولاء نے اہلِ نظر کو دکھا دیا
عیسیٰ کو بچپنے میں مسیحا بنا دیا

ہر خشک و تر کا ذکر ہے اس کلیات میں
ہیں انگنت خواص اثر مفردات میں
ہر طرح نفع بخش حیات و ممات میں
صحت بھی اور نجات بھی دونوں ہیں ہاتھ میں
تاثیر کا ہے قول اثر اس کا نام ہے
کل کا حکیم جو ہے یہ اس کا کلام ہے

عیسیٰ سے بڑھ کے آپ ہیں، قائل خدائی ہے
ظاہر ہر ایک عضو سے معجز نمائی ہے
صحت کی نبض ہاتھ میں یوں کس کے آئی ہے
ایسا طبیب حق نے قسم جس کی کھائی ہے
مذکور ہے قسم کا بھی اس کلیات میں
جس کو وہ دے چکا ہے محمدؐ کے ہاتھ میں

Scanned with CamScanner

مفوض حسین نصیریؔ

سخنورؔ کے دوسرے بھائی مفوض حسین نصیریؔ (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) مفوض حسین نصیریؔ کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا اور نہ ہی ان کا کلام دستیاب ہے لیکن یونسؔ زید پوری کے ایک ترحیمی نوحہ سے ان کی شخصیت اور ان کی وفات سے یونسؔ کے غم کا اندازہ ہوتا ہے:

غم کوئی شہ دیں کے نہیں غم سے زیادہ
غم آپ کا ہے سب کے غم و ہم سے زیادہ
ہم روئیں گے کیا روئے ہیں سجاد پدر کو
تڑپے ہیں کہیں حضرت آدمؑ سے زیادہ
یاد آتے ہیں مجلس میں نصیریؔ ہمیں یونسؔ
روتے تھے شہِ دیں کو وہ کچھ ہم سے زیادہ

بقول سید سبط الرضاء مرحوم' آپ گریجویٹ تھے اور ایک معزز سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ ملازمت میں مصروفیت کے باوجود مذہبی اور سماجی امور میں دلچسپی رکھتے تھے۔ قصیدے، رباعیاں اور قطعات خوب کہے ہیں۔ سرکار ناصر الملت آیت اللہ سید ناصر حسین موسوی طاب ثراہ کی محفلوں کے خاص رکن تھے۔' ۷ر شعبان ۱۳۵۷ھ/ ۳۰ر نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ ان کے بڑے بھائی یونسؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

یونس اسیر بند تعب مبتلائے درد
از بہر سال عیسوی ایں بیت نظم کرد
مداح ادیب اہل ولا سید اہل جود
زائر وحید عصر مفوض حسین بود
۱۹۳۸ء

العلم بمبئی کے ''نعت خیر المرسلین نمبر'' ۵۱ء میں مفوض حسین نصیریؔ کا ایک نعتیہ قصیدہ شائع ہوا ہے جس کے مدح کے چند اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں جس سے ان کی قصیدہ گوئی کا عرفان ہوتا ہے:

حد ہے حد غیر گل افشاں ہیں ثنا خوانی میں
اہلِ اسلام پیمبر کی ریاضت دیکھیں
لفظ ملتے نہیں کن لفظوں میں تعریف کروں
اہلِ علم آپ کی شان اور جلالت دیکھیں
دوسرے میں نہیں یہ بات جو بات آپ میں ہے
آپ کی باتوں میں قرآں کی فصاحت دیکھیں
پھر نظر اس پہ کریں راہ پہ آئے گمراہ
بیشتر آپ کا اندازِ ہدایت دیکھیں
انتہا یہ ہے کہ محبوبِ خدا ہو گئے آپ
عاشق اللہ ہوا حسنِ عبادت دیکھیں
دیکھنا جس کو ہے مطلوب نصیریؔ کا وقار
آج کیا کل وہ خدا داد جلالت دیکھیں
یہ تہی دست ہے پابندِ حدیثِ ثقلین
دونوں ہاتھوں میں ہی سامانِ قیامت دیکھیں

Scanned with CamScanner

ایک میں نامۂ اعمال کی صورت قرآں
اک میں رحمت کی سند دامنِ عترت دیکھیں

ایک دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا احساس ہوتا ہے:

آپ کی ذات وہ ہے جس میں ہیں اضداد بہم
ہم کو بتلائے کوئی کیا نہ کہیں؟ کیا کہیں ہم
اسم اعظم بہ خدا ہے ترا نام نامی
کلمہ پڑھتی ہی رہی جس کا زبان آدم
ہاشمی مطلبی فخر اب و جد حیدر
بھائی ہیں آپ کے محبوب خدا حمزہ عم
ماں وہ ماں مہد نبوت رہی جن کی آغوش
باپ وہ باپ جو تھا حرز رسالت ہمہ دم
قابل فخر نصیری ہے مقدر تیرا
تو کہاں اور کہاں ناصر ایماں کا قدم

متوسط حسین اکمل

یونس، کے ایک اور بھائی سید متوسط حسین اکمل اپنے دور کے ممتاز صاحبان علم و فضل میں شمار ہوتے تھے، شاعری کا ذوق فطری تھا، مرزا اوج مرحوم کے شاگرد تھے۔ انتہائی خوش مزاج، بذلہ سنج، نکتہ رس اور ذکی الطبع تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی سید متوسط حسین اکمل کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''اکمل کے مراثی سادگی بیان، لطف زبان، سلاست، روانی اور تاثیر سے بھرپور ہیں''۔ ۵۲

اکمل کو الفاظ کے انتخاب اور لفظوں کے تال میل سے صوتی اثر و آہنگ پیدا کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ بطور مثال حضرت عباس کے مرثیہ کی آمد کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

رن میں اسد بیشۂ حیدر کی ہے آمد
دل ہلتے ہیں سینوں میں دلاور کی ہے آمد
ہلچل ہے ہر اک صف میں کہ صفدر کی ہے آمد
عباس کی یا فاتح خیبر کی ہے آمد
شبدیز فلک سیر ہے جانباز کا رو میں
اقبال و حشم داہنے بائیں ہیں جلو میں

Scanned with CamScanner

سطوت سے عیاں قدرت غفار کو دیکھو
شان علم و رعب علم دار کو دیکھو
کب دیکھا تھا پھر حمزۂ جرار کو دیکھو
فخر و شرفِ جعفر طیّار کو دیکھو
سرتا بہ قدم شان ہے خالق کے ولی کی
جب پورے جواں تھے یہی صورت تھی علیؑ کی

اکمل نے اپنے مرثیوں میں منظر کشی بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ ان کے مراثی میں صبح و شام اور بہار و خزاں وغیرہ کے مناظر کافی ملتے ہیں۔ ایک مرثیہ سے جنت کا منظر نامہ ملاحظہ فرمائیں:

وہ پھول کہیں سبز، کہیں سُرخ، کہیں زرد
ہو جن کے تماشے سے فراموش غم و درد
نزہت میں، نزاکت میں، لطافت میں ہر اک فرد
پاکیزہ ہوا گرم زیادہ، نہ بہت سرد
یوں چلتی ہے رہ رہ کے مزے ملتے ہیں جس سے
غنچوں کے سدا غنچۂ دل کھلتے ہیں جس سے

وہ قصر دل آویز و مرصع بہ جواہر
تعریف سے جن کی ہے خرد عاجز و قاصر
ترکیب میں بے مثل، عمارت میں ہیں نادر
یکساں دل مومن کی طرح باطن و ظاہر
حیرت ہو بشر بہر تماشا جد حر آئے
آئینہ دیوار میں صورت نظر آئے

اکمل کے مراثی میں مصائب کا حصہ کافی دردناک ہوتا ہے۔ ان میں الم نگاری کی اچھی صلاحیتیں موجود تھیں، زبان کی سلاست اور صفائی مرثیہ کے درد و اثر میں کافی اضافہ کر دیتی ہے۔

ابن حسن، حسنؔ

سید ابن حسن، حسنؔ زید پوری فراستؔ کے نواسے ہیں۔ پہلے فراستؔ سے تلمذ تھا بعد ازاں محسنؔ زید پوری سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شیدائے اہلبیت تھے اور متعدد بار عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے اور بالآخر کربلائے معلیٰ میں سکونت اختیار کر لی اور ۱۹۶۴ء میں وہیں کی خاک میں پیوند ہوئے۔ حسنؔ نے متعدد مرثیے کہے لیکن ان کا سب سے قابل ذکر مرثیہ وہ ہے جس میں انہوں نے کربلائے معلیٰ کی تاریخ اور وہاں کی مختلف زیارت گاہوں کی تفصیل نظم کی ہے۔ حسنؔ کے مراثی بڑے گریہ خیز اور مبکی ہیں اور وہ اپنی ساری صلاحیتیں گریہ خیزی پر صرف کرتے ہیں۔ تلوار کی تعریف کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

کاٹ کر نیزوں کو پھر تیغوں کے جوہر کاٹے
ایک ہی وار میں چار آئینے یکسر کاٹے
راستے جنگ کے دونوں نے برابر کاٹے
خود کو قطع کیا، جوشن و بکتر کاٹے
ٹکڑے ٹکڑے کیا چلتے ہوئے رہواروں کو
خون میں غرق کیا فوج کے خونخواروں کو

قطع امید ہوئی فوج ستمگار کئی
جو کھڑی سامنے تھی کفر کی دیوار کئی

Scanned with CamScanner

ہر صف لشکر کیں صورت کہسار کٹی
کہیں نیزہ، کہیں خنجر، کہیں تلوار کٹی

دنگ تھے اہل جفا کب یہ لڑائی دیکھی
کہتے تھے ایسی نہ تیغوں کی صفائی دیکھی

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی حسنؔ کے مرثیوں کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''حسنؔ کے مراثی بالکل سادے اور بیانیہ انداز میں ہوتے ہیں لیکن اسکے باوجود کافی غم آفریں اور مبکی ہوتے ہیں، مضمون آفرینی اور زور بیان وغیرہ سے یہ مراثی محروم ہیں لیکن خلوص وعقیدت کا جوہر ان میں بھرپور نظر آتا ہے''۔ ۵۳

بقول علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی حسنؔ زید پوری کا ایک مرثیہ ''چراغ حرمین'' صادق پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا مرثیے کا مطلع ہے:

بیت شبیر بیوۃ اذن اللہ میں ہے
قدر جس کی دل پیغمبر ذی جاہ میں ہے
سیب جنت کی مہک بھی اسی درگاہ میں ہے
نور اسی کا ہے جو یہ شمس میں اور ماہ میں ہے
حق کے محبوب کا محبوب جو یہ روضہ ہے
سورۂ نور ثنا کرتا ہوا آیا ہے

اور اس مرثیے کا مقطع ہے:

بس حسنؔ دل میں جو ارمان تھا وہ بر آیا
شامل حال ترے ہوگئی تائید خدا

دونوں سرکاروں میں حاضر جو ہوا صبح و مسا
نظم یہ مرثیہ کل یاں پہ ہوا صل علا

گہہ مرے پیش نظر قبر علمدار کی تھی
قبر گہہ سامنے شبیر دل افگار کی تھی

بطور مثال ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے:

چلے سرور نبیؐ کے شہر کی حالت بدلتی ہے — مدینے سے زمین کربلا قسمت بدلتی ہے
حسین انصار کے ہمراہ جاتے ہیں سوئے مقتل — رسولؐ اللہ کا روضہ چھٹا صحبت بدلتی ہے
چراغ قبر احمد کربلا میں بجھنے جاتا ہے — ہوا اندھیر کیسا نور سے ظلمت بدلتی ہے
اماں پاتے نہیں شبیر کعبہ میں بھی اعدا سے — یہ مجبوری ہے حج کی عمرے سے نیت بدلتی ہے
حسینی قافلے والے نہیں کم صبر میں لیکن — دلوں میں کروٹیں پیہم رگ ہمت بدلتی ہے
ہے کافی چادر تطہیر زینبؑ کے کھلے سر پر — جو عصمت پوش ہے اس کی کہیں عزت بدلتی ہے
لب دریا سے ریتی پر عدو شہ کو ہٹاتے ہیں — زمیں روتی ہے جائے خیمہ حضرت بدلتی ہے
دہم کی شب کا جانا روز وصل یار کا آنا — بہتر عاشقوں کے دل کی کیفیت بدلتی ہے
نواسے شیر حق کے کھیلنے جاتے ہیں تیغوں سے — سن ایسے ہیں کہ ماں کپڑے دم رخصت بدلتی ہے
سپاہ شام کا مہمان جاتا ہے سوئے کوثر — بلاتا ہے خدا شبیر کو، دعوت بدلتی ہے

خدا تو ایک ہے لیکن خدا یائے سخن صدہا
حسنؔ افسوس ہے وحدت سے یوں کثرت بدلتی ہے

Scanned with CamScanner

نفاستؔ حسین نفاستؔ

فراستؔ کے بھائی سید نفاست حسین نفاستؔ زید پوری (م ۱۶ر ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۔۱۸ مئی ۱۹۰۸ء) نے صرف ۳۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''نفاستؔ اچھی اور معیاری زبان استعمال کرتے تھے، کلام اسقام سے پاک ہے، بیان سادہ اور سلیس ہوتا ہے، صحت روایت کا بڑی شدت سے التزام رکھتے تھے''۔ ۵۴

'مضامین عجائب' کے نام سے فراستؔ زید پوری کے شاگردوں کے مراثی نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے جس میں نفاستؔ کے مراثی بھی موجود ہیں ان مراثی میں 'بلبل باغ نفاستؔ ہے طبیعت میری' لاجواب مرثیہ ہے۔

نفاستؔ کو رزم اور مناظر قدرت نظم کرنے کا سلیقہ خوب آتا ہے اور مرثیت کو شاعری پر قربان نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی میں مصائب کا جزو کم سہی مگر کافی پر تاثیر ہے۔ نفاستؔ نے صبح کے منظر نامے کو بھی بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے جو مناظر قدرت کی بہترین مثال ہے:

باغ جہاں کا رنگ بدلنے لگی نسیم
گلشن کی پتریوں پہ ٹہلنے لگی نسیم

جھرمٹ سے ڈالیوں کی نکلنے لگی نسیم
فرحت کی راہ کھل گئی چلنے لگی نسیم

انبار گل ہوا نے زمیں پر لگا دیا
صحن چمن میں نور نے بستر لگا دیا

شبنم میں صاف صاف تھا در عدن کا رنگ
لالے کی پنکھڑی میں عقیق یمن کا رنگ
نرگس کی وہ پھبن وہ گل یاسمن کا رنگ
رنگیں صدائیں طائروں کی وہ چمن کا رنگ

دھانی کوئی، تو کوئی شہابی نظر پڑا
تختہ کوئی چمن کا گلابی نظر پڑا

رنگت میں بے نظیر، نزاکت میں فرد پھول
آنکھیں ہوں وقت سیر خنک ایسے سرد پھول
یہ نور تھا ستاروں کو کرتے تھے گرد پھول
کلیاں کہیں سفید، کہیں سرخ و زرد پھول

جو رنگ چاہتی تھیں وہ حق نے عطا کیا
شاخوں نے جھک کے شکر کا سجدہ ادا کیا

نازاں ہے راستی پہ صنوبر کو دیکھئے
آنکھیں خنک ہوں حسنِ گلِ تر کو دیکھئے
روئے زمیں پہ نور کی چادر کو دیکھئے
صحنِ چمن میں پھولوں کے بستر کو دیکھئے

جس سمت دیکھو در ہے کشادہ سرور کا
ہر اک روش ہے باغ میں جادہ سرور کا

Scanned with CamScanner

تازہ ہو روح دیکھ کے رنگینیٔ چمن
دل جس سے باغ باغ گلوں کی وہ انجمن
وہ جھومتے درخت وہ شاخوں کا بانکپن
بیخود صبا ہے سونگھ کے پھولوں کے پیرہن
گلزار ہے بسا گل خوشبو مہکتے ہیں
طائر ہیں مست وجد میں ہر سو چہکتے ہیں

نفاستؔ نے اپنے مرثیوں میں فنی نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مختلف روایتوں کو بھی نظم کیا ہے۔ اپنے ایک مرثیے ۔ع۔

مشہور خلق خوبیٔ فصلِ بہار ہے

میں انہوں نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے خون سے سرزد ہونے والے ایک معجزے کو نقل کیا ہے۔ یہ معجزہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایک طائر کے ذریعے مدینۂ رسولؐ میں خبرِ شہادت کے تعلق سے ہے۔ واقعہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

جب رن میں قتل ہو گیا حیدر کا نورِ عین
خیمہ سے نکلی دختر خاتون مشرقین
مابین آسمان وزمیں یوں بشور وشین
آواز جبرئیل نے دی کشتہ شد حسینؑ
بے آب شمر نحس کا خنجر ہزار حیف
سوکھا گلا لہو سے ہوا تر ہزار حیف

اور وہ طائر دوسرے طائروں سے کچھ اس طرح گویا ہوتا ہے:

بے آب و دانہ مر گیا سلطانِ کربلا
ہے زینت نشیب سلیمان کربلا

اے طائروں شہید ہوا فاطمہ کا لال
لاشہ بھی رن میں ہو گیا افسوس پائمال
میں نے بچشم جا کے جو دیکھا یہ شہ کا حال
خونِ امام پاک میں لوٹا بصد ملال
جس دم یہ طائروں نے سنا نوحہ خواں ہوئے
بیتاب ہو کے جانب مقتل رواں ہوئے

اس غم والم کے منظر نامے میں طائر مدینۂ رسولؐ کی طرف روانہ ہوتا ہے تا کہ اہلِ مدینہ کو امام حسینؑ کی شہادت کی خبر دے اور قبرِ رسولؐ پر جا کر پرسہ بھی پیش کرے۔ رسولؐ خدا کو ان کے نواسے کا پرسہ طائر کی زبانِ بے زبانی نفاست نے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ ان کی فنکاری اور واقعہ نگاری پر ان کی گرفت کا بیّن ثبوت ہے:

ان میں سے ایک جانبِ یثرب ہوا رواں
طے کر کے راہ دور وہ کرتا ہوا فغاں
پہنچا مدینۂ نبوی میں وہ ناگہاں
روضہ میں مصطفیٰ کے یہ جا کر کیا بیاں
واحسرتا خون بہا بھوکے پیاسے کا
پرسہ میں شہ کو دیتا ہوں پیارے نواسے کا

گرد ضریح پھر کے کئے اس طرح جو بین
طائر تمام جمع ہوئے سن کے شور وشین
اپنی زباں میں کرنے لگے ماتم حسینؑ
کہتے تھے رو کے ہائے پیمبر کے نورِ عین
مذبوح کی طرح سے وہ سب بیقرار تھے
پرسہ نبی کو دیتے تھے اور اشکبار تھے

Scanned with CamScanner

اہلِ مدینہ دیکھ کے یہ حال غم فزا
حیرت سے کہہ رہے تھے کہ یہ ماجرا ہے کیا
پھر بعد چند روز کے جس وقت یہ سنا
یعنی ہوئے شہید شہنشاہِ کربلا
سب کو ہوا یقین کہ طائر جو آیا تھا
مظلوم کربلا کی سنانی وہ لایا تھا

طائر مدینہ منورہ میں شہادت امام حسینؑ کی سنانی سنانے کے بعد ایک یہودی کے باغ میں چلا گیا۔ اس یہودی کی بیٹی بہت دنوں سے بیمار تھی لیکن اس درخت کے نیچے گئی جہاں درخت پر وہ طائر بیٹھا تھا۔ اب معجزہ کا منظر نامہ نفاستؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

لکھا ہے زیرِ نخل جو پہنچی وہ نیم جاں
طائر کے ساتھ آپ بھی کرنے لگی فغاں
ٹپکا پروں سے اس کے جو خونِ شہ زماں
اک قطرہ اس کی آنکھ پہ آکر ہوا رواں
کیا روشنی تھی باغ وہ سارا چمک گیا
پردے میں شب کے آنکھ کا تارا چمن گیا

ٹپکا پھر ایک قطرۂ خونِ شہ زمن
آنکھ اس کی دوسری ہوئی پرنور دفعتن
بعد اس کے دست و پا پہ ہوا فضلِ ذوالمنن
ملتے ہی خون غیرت گل ہو گیا بدن
اعضا قمر کی طرح سے پرنور ہو گئے
داغِ سفید جسم میں کافور ہو گئے

نفاستؔ کو مکالمہ نگاری پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ ایک مرثیہ۔ ع۔

غربت میں میہماں نہ کسی کو قضا کرے

میں نفاستؔ نے اسے بخوبی پیش کیا ہے۔ نفاستؔ نے حضرت مسلم ابن عقیل کی غربت میں بے سروسامانی کے واقعہ کو نظم کے قالب میں ڈھالتے ہوئے جس زبان و بیان کا استعمال کیا ہے وہ مکالمہ نگاری کی بہترین مثال ہے۔ ہانی ابن عروہ کی گرفتاری کے بعد جب مسلم طوعہ کے گھر مہمان ہوتے ہیں اور طوعہ کا بیٹا مسلم کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور رات کے وقت جب وہ تھکا ہارا گھر آتا ہے۔ ماں بیٹے کی اس نفسیاتی کشمکش ملاحظہ فرمائیں اور مکالمہ نگاری کا حسن بھی دیکھیں۔ ساتھ ہی دونوں کی مزاجی کیفیت کا بھی اندازہ لگائیں:

خو بو تھی اس میں گل کی یہ عادت میں خار تھا
دل اس کا صاف قلب میں اس کے غبار تھا
وہ سرو باغ دیں تو یہ رشک چنار تھا
وہ پارسا یہ فاسق بے اعتبار تھا
لاریب مستحقِ عذابِ شدید کا
حیدر کی وہ کنیز یہ بندہ یزید کا

لیکن ماں کی کیفیت کو دیکھ کر بیٹا مخاطب ہوتا ہے:

ماں سے کیا خطاب کہ حیرت کمال ہے
مجھ سے تو کر بیان یہ کیا تیرا حال ہے
پہلے جھڑک کے کہنے لگی یہ وہ خونہاد
کیا دخل اس میں تجھ کو ہے اے سست اعتقاد
میں خوب جانتی ہوں ترے دل میں ہے فساد
مادر کو اس نے دی قسم خالق عباد
بولی کہ اس کنیز کے رتبے بڑھائے ہیں
مسلم بن عقیل مرے گھر میں آئے ہیں

Scanned with CamScanner

ہرگز یہ راز فاش نہ کرنا پئے خدا
بولا شریر بخت مرا ہو گیا رسا
گھر میرا اور وکیل دل و جانِ مصطفیٰؐ
لیکن کہا یہ دل سے کہ بر آیا مدعا
ہوتے ہی صبح خلعت زرتار پاؤں گا
ابن زیاد کو یہ خبر میں سناؤں گا

آخر کار ابن زیاد کو خبر ہو جاتی ہے اور حضرت مسلم بن عقیل کو مجبوراً تلوار نکال کر گھر سے باہر آنا پڑتا ہے۔ اس ماحول میں حضرت مسلم کی جنگ بھی قابلِ دید ہے:

مسلم نے بھی نیام سے لی تیغ خونچکاں
پھر دست حق پرست کے جوہر ہوئے عیاں
بے دست و پا تھے لشکر بے پیر کے جواں
بسمل ہوئے شریر ہوا شور الاماں
دامن زمیں کا خون سے گلنار ہو گیا
ایسا لڑے کہ لاشوں کا انبار ہو گیا

بالائے سر چمکتی تھی شمشیرِ تیز دم
بیجاں کوئی تھا اور کوئی توڑتا تھا دم
سر جسم سے جدا ہوا جس کا بڑھا قدم
تلوار کی زباں نے بتائی رہِ عدم
حیراں ہر ایک ظالم خوں خوار ہو گیا
اعدا کا خون نقش بہ دیوار ہو گیا

نفاستؔ کو رزم نظم کرنے کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے۔ ایک مرثیہ جو حضرت قاسم کے حال پر مشتمل ہے اس میں رجز کے ساتھ ساتھ منقبت کا انداز بھی قابلِ دید ہے۔

صد شکر کہ مشہور دو عالم ہے مرا گھر
عم ہیں مرے شبیر پدر ہیں مرے شبر
قاسم ہوں میں دادا ہیں مرے ساقی کوثر
حیدر اسد اللہ علی فاتح خیبر
کیا کیا نہ شرف ان کو دئے رب ہدا نے
نام اپنا دیا بندۂ نامی کو خدا نے

لوح و قلم و نار و جناں ظاہر و پنہاں
حور و ملک و ارض و سما صرصر و باراں
مور و ملخ و طائر و انسان و بنی جاں
دنیا کے شجر ریگ و حجر بحر و نیستاں
ان سب پہ شرف حیدر صفدر کے جلی ہیں
سب کا یہ وظیفہ ہے علیؑ حق کے ولی ہیں

بعد ان کے امام دو جہاں شبر و شبیر
اسلام کے ایماں کے نشاں شبر و شبیر
سلطان زمن شاہ زماں شبر و شبیر
سردار جوانان جناں شبر و شبیر
بستان ولایت کے ضیا بار شجر ہیں
افلاک ہدایت کے یہ خورشید و قمر ہیں

منقبت کے لطف کے بعد تلوار کی خصوصیت بھی ملاحظہ فرمائیں اور ساتھ ہی تمہیات کا رنگ بھی دیکھیں جو دبستانِ دبیر کی بنیادی صفت ہے:

رتبے میں عصائے کفِ موسیٰ کہوں اس کو
جلوے میں نظیر ید بیضا کہوں اس کو

Scanned with CamScanner

برق غضب خالق یکتا کہوں اس کو
اے روح امیں کیا میں لکھوں کیا کہوں اس کو

چلاتے تھے شامی کہ عیاں تیغ کی ضو ہے
شمشیر نہیں اوج ظفر کا مہ نو ہے

لوہے میں کھری آب میں بے مثل تھی تلوار
تھی ایک ہزاروں میں تو لاکھوں میں نمودار
خوش وضع، خوش انداز، خوش اسلوب، خوش اطوار
خوں ریز، دلآویز، بلا خیز، شرر بار

پھل اس چمن دہر میں نایاب تھا اس کا
تریاق پئے زہر ستم آب تھا اس کا

جاتے تھے عدو اس کے اشارے سے سقر میں
ہم پہلوئے دل تھی کبھی داخل تھی جگر میں
لرزاں تھے شقی دھوم تھی اقلیم ظفر میں
یہ آہ دل بیوۂ شبر سے اثر میں

اس شان سے نکلی کہ خجل فوج لعیں ہے
حسرت دل قاسم کی ہے تلوار نہیں ہے

تلوار کے بعد حضرت قاسم کے مرکب کی خصوصیات بھی نفاستؔ کے قلم حقیقت رقم سے ملاحظہ فرمائیں:

تلوار کی ضربت سے پریشاں تھے ستمگر
صد پاش تھے رہوار کی ٹاپوں سے تن و سر
یوں بھاگ گئے رخش کے صیحے سے بداختر
لاحول سے جس طرح شیاطین کا لشکر

میداں سے جفا کاروں کے منہ موڑ کے پلٹا
ہر سمت دل آزاروں کے دل توڑ کے پلٹا

وہ چال وہ چھل بل وہ دغندیں وہ طراریں
بڑھ سکتے نہ تھے اڑنے میں نعلوں کے شرارے
ایسی تھی صدا اسپ کی دریا کے کنارے
جس طرح کوئی شیر ترائی میں ڈکارے

جب قصد کیا نہر سے میدان میں پہنچا
نیزوں کے نیستاں میں عجب شان سے پہنچا

باریک وہ جلد اس کی وہ ابھرا ہوا سینہ
اڑنے کا وہ انداز وہ جمنے کا قرینہ
تھا شور کہ رفعت میں یہ ہے عرش کا زینہ
عطر گل فردوس سے خوشبو ہے پسینہ

جو تھوتھنی میں حسن ہے کنڈے سے جلی ہے
شاخ شجر خلد میں سر بستہ کلی ہے

نفاستؔ نے بے شمار سلام بھی کہے ہیں سلام کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

یاد جب تشنگی شاہ ہدا آتی ہے — بہتے دریاؤں سے آواز بکا آتی ہے
شہ اٹھا لائے ضعیفی میں پسر کا لاشہ — ہائے کس طرح کلیجے کو سنبھالا ہوگا

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مطابق:

''نفاستؔ کو زبان و بیان پر جو قابو حاصل تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر جوانی میں ہی ان کا انتقال نہ ہو جاتا تو زید پور کے مرثیہ گویوں میں ان کا مرثیہ بہت بلند ہوتا، پھر بھی انہوں نے جو مراثی چھوڑے ہیں وہ حسن زبان اور

Scanned with CamScanner

لطافت بیان دونوں کے اعتبار سے کافی اچھے اور معیاری
کہے جاسکتے ہیں''۔ ۵۵

یونسؔ زید پوری کے نفاستؔ کے انتقال پر جو تاریخ کہی ہے وہ بہت نمایاں اہمیت کی حامل ہیں یہ تاریخ صنعت قالی میں سعدیؔ کے مشہور مصرع سے نکالی گئی ہے:

منہ دل بریں منزل جاں ستاں — زسعدیؔ ہمیں یک سخن یادوار
نفاست حسین ابن ضامن حسین — جوان وخوش اعمال و پرہیز گار
سخن سنج و مداح آل رسولؐ — عزادار وزائر ستودہ شعار
سفر کرد از دار غم یک بیک — دل خویش و بیگانہ شد بے قرار
پئے سال تاریخ یونس بخواند — مکن تکیہ بر عمر ناپائدار

۱۳۲۶ھ

فائزؔ حسین فائزؔ

فراستؔ کے بھتیجے اور شاگرد۔ بیالیس سال کی عمر پا کے ۲۴ر جمادی الاول ۱۳۳۸ھ/۱۵ر فروری ۱۹۲۰ء کو چچا کو داغ مفارقت دے گئے۔ فراستؔ کے لائق و فائق فرزند عارجؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

کرد عارجؔ نظم بہر سال رحلت مصرعہ — زیر منبر دفن شد مداح اولاد رسول

۱۳۳۸ھ

فائزؔ جہاں اچھے خوش نویس تھے وہیں خوش فکر شاعر بھی تھے اور ہر صنف سخن میں فکر آزمائی کرتے تھے۔ لیکن مرثیہ گوئی سے خاص دلچسپی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مطابق:

''فائزؔ کے مراثی میں دبستان دبیر کی ساری روایتی خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ شکوہ الفاظ، مضمون آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی کے شدت سے قائل تھے، جوش بیان سے ان کا ہر مرثیہ مملو نظر آتا ہے، خاص طور پر رزم کے بیان میں جوش بیان اور خروش فکر قابل دید ہوتا ہے، سراپا میں کافی مضمون آفرینی سے کام لیتے تھے'' ۵۶

'مضامین عجائب' میں فائزؔ کے جو مراثی شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فائزؔ کو زبان و بیان پر اچھی دسترس تھی اور ان کے کلام میں وہ رنگینی و رعنائی

Scanned with CamScanner

واثر و دلکشی اور حسن بیان پورے طور پر پایا جاتا تھا جو کامیاب مرثیہ نگاری کے لئے ضروری ہے۔ بطور مثال دو بند ملاحظہ فرمائیں:

کیسے گل شاداب کسے کہتے ہیں گلشن
تھے دیدۂ نرگس، نہ زباں رکھتی تھی سوسن
شاخوں کی نزاکت تھی نہ کلیوں کا تھا جوبن
تھے جامۂ ہستی سے جدا پھولوں کے دامن
ظاہر اثر بادِ بہاری نہ ہوا تھا
نہریں تھیں کہاں حکم ہی جاری نہ ہوا تھا

مشہور ہوا کل گل و بلبل کا فسانہ
تب حسن کا حیلہ تھا نہ الفت کا بہانہ
یوں رنگ بدلتا تھا نہ ہر وقت زمانہ
ہوتے تھے نہ یہ قافلے دنیا سے روانہ
بت کہہ دیں کہاں یہ تھے کہاں ان کے مکاں تھے
بیٹھے ہیں خدا بن کے یہ اس وقت کہاں تھے

فائز کے مرثیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رزم بیان کرتے وقت فنی لوازمات کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ حضرت حر کے مرثیے میں تلوار کی خصوصیت کو جس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے وہ ان کی مشاقی کی دلیل ہے:

حسام تیز ہزاروں کو مارتی آئی
غرور ظالم سرکش اتارتی آئی
جو کام بگڑا ہوا تھا سنوارتی آئی
میں صدقے تجھ پہ قضا یہ پکارتی آئی

سروں سے قعرِ جہنم کو پاٹنے والی
سپاہ کفر کے جنگل کو کاٹنے والی

سروں پہ برق کی صورت چمک چمک کے گئی
ہر ایک صف کے سروں پر سرک سرک کے گئی
رخوں پہ شعلہ کی صورت لپک لپک کے گئی
ہزار ناز و ادا سے لچک لچک کے گئی
ہر ایک سمت نئی چال ڈھال سے آئی
زباں پہ قبل اماں کے سوال سے آئی

فائز کو سراپا نظم کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ ایک مرثیہ جو حضرات عون و محمد کے حال کا ہے اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔ سراپا نظم کرتے وقت بھی فائز نے اصلاح و تبلیغ سے کام لیا ہے:

سورج ہے خجل مطلع انوار ہیں آنکھیں
واللہ عجب دولت بیدار ہیں آنکھیں
روشن ہے نظر کردۂ غفار ہیں آنکھیں
اسلام کی محفل میں ضیا بار ہیں آنکھیں
غافل سے اشارہ ہے نہ کر ترک حیا کو
اے کور دل ان آنکھوں سے آ دیکھ خدا کو

ان کی نظر لطف سے گلشن ہوئے صحرا
ترچھی جو نظر کی تہ و بالا ہوئی دنیا
دکھلایا جو خالق نے وہ ان آنکھوں نے دیکھا
حق ہیں یہی آنکھیں ہیں یہ ہیں دیدۂ بینا
کوثر کا پتا ملنے لگا جوش بکا سے
راتوں کو ہوئے اشک رواں خوفِ خدا سے

Scanned with CamScanner

ذیل میں حضرات عون و محمد کی پیشانیاں ملاحظہ فرمائیں جس سے اقبال کے مومن کامل کی شان ہویدا ہے:

پیشانیاں ان کی ہیں کہ دو قلزم رحمت
بحرین میں ان دونوں کا ہے جوشِ محبت
جو حسن کی دولت ہے وہ ہے ان کی بدولت
یوسف بھی ثناخواں ہے کہ بے مثل ہے طلعت
توقیر بڑھی نیر اعظم کی انہیں سے
ہے اوج پہ تقدیر دو عالم کی انہیں سے
آئینہ ایماں جو کہوں ان کو بجا ہے
حیرت میں قمر ہے کہ عیاں شانِ خدا ہے
سجدے کا نشاں طاعت خالق کا پتا ہے
کیا اختر تقدیر ہے کیا بخت رسا ہے
مقبول عبادت ہوئی احمدؐ کی علیؑ کی
پیشانیوں پہ مہر ہے رب ازلی کی

فائزؔ نے اپنے عہد کے دوسرے مرثیہ نگاروں کی طرح اپنے مرثیوں میں بھی ساقی نامہ کا التزام رکھا ہے۔ اس میدان میں بھی فائزؔ نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں:

بیتاب ہوں ساقی مرے آ، بہر خدا آ
مشتاق مئے نور ہوں، لا، جام وسبو لا
دھو جائے مرے نامۂ اعمال کا دھبا
اترے نہ پس مرگ بھی نشہ ہو کچھ ایسا
ہر دن ہو مرا لطف کا راتیں ہوں مزے کی
تربت میں نکیرین سے باتیں ہوں مزے کی

اے جوش ولا، چشمۂ کوثر کا پتا دے
اے دست خدا، رند کا دل آج بڑھا دے
اے بحر عطا، بادۂ تسنیم پلا دے
اے شمس ضحیٰ، آنکھوں سے پردوں کو اٹھا دے
منظور ہے نظارہ دلیروں کی وغا کا
میداں نظر آجائے ابھی کرب و بلا کا

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں جنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس جزو کو بھی فائزؔ نے بخوبی نبھایا ہے۔ ان کے یہاں جنگ کا رنگ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اے صلِ علیٰ عون و محمد کی وہ پیکار
یہ جعفر طیار تھے وہ حیدر کرار
آتی تھی در خیمہ پہ تلوار کی جھنکار
تیغ اسد اللہ پھڑک جاتی تھی ہر بار
کہتی تھی قضا تیغ سر انداز نہ روکیں
اللہ کرے ہاتھ یہ جانباز نہ روکیں
اک وار بھی اک نیچے کا، رک نہیں سکتا
مجبور ہیں سب قہر خدا، رک نہیں سکتا
روکے سے کبھی پیک قضا، رک نہیں سکتا
دریا جو بہا، بس وہ بہا، رک نہیں سکتا
رک سکتے ہیں جن سے نہ ملک سے نہ بشر سے
جاہیں تو گزر جائیں یہ گردوں کی سپر سے
یہ چال حسینوں کو بھی چلتے نہیں دیکھا
اطفال کو اس طرح مچلتے نہیں دیکھا

Scanned with CamScanner

یوں رنگ زمانے کو بدلتے نہیں دیکھا
پی پی کے لہو زہر اگلتے نہیں دیکھا
دو ناگنیں اونچی کبھی نیچی ہوئیں رن میں
خوں سوکھ گیا خوف سے اعدا کے بدن میں

فائزؔ نے بین کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ بطور مثال صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

تقدیر نے دکھلایا عجب حشر کا ساماں
بیدم ہیں پڑے خاک پہ وہ ناصر ایماں
روتے ہیں کھڑے شیر خدا با سر عریاں
سینے میں سنبھالے سے نہ سنبھلا دل نالاں
آغوش میں ٹوٹے ہوئے تاروں کو اٹھایا
تھراتے ہوئے ہاتھوں سے پیاروں کو اٹھایا

فائزؔ کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے مرثیوں میں جدت اختیار کی ہے۔ نیز انہوں نے صرف دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ صاحبانِ نظر کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ میرے مرثیے کا مطالعہ کریں اور فن میں اس جدت پر خداوند کریم کا شکر ادا کرتے ہیں:

بس خامۂ فائزؔ کہ یہ ہنگام دعا ہے
تو اور یہ تجدید سخن شانِ خدا ہے
سب مرثیے شاہد ہیں کہ بندش بھی جدا ہے
معبود سے کر عرض یہ احسان ترا ہے
مداح کیا تو نے ولی ابن ولی کا
زائر بھی مجھے کر دے حسینؑ ابن علیؑ کا

محمد عارجؔ، عارجؔ

سید محمد عارج نام، عارجؔ تخلص، فراستؔ زید پوری کے اکلوتے فرزند جو محض ۳۳ سال کی عمر میں ۱۳۴۶ھ میں بوڑھے باپ کو داغ مفارقت دے گئے، فراستؔ کے اس باکمال فرزند کا فراستؔ سمیت تمام اعزا نے ماتم کیا۔ یونس زید پوری نے تاریخ کہی:

گفت یونس پئے تاریخ وفات ایں مصرع
زجہاں سوئے جناں نیک وجواں عارج رفت
۱۳۴۶ھ

فائزؔ اور نفاستؔ کے بعد عارجؔ کے غم نے فراستؔ کی کمر توڑ دی جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک رباعی میں کیا ہے:

مے کش نہ رہے تو جام ساقی نہ رہا — صد حیف وہ لطف خوش مذاقی نہ رہا
مجبور ہے باغبان قسمت اس کی — جو پھول کھلا چمن میں باقی نہ رہا

عارجؔ نے اس مختصر سی عمر میں مرثیہ، سلام، قصائد، رباعیاں غرض سب کچھ کہا اور خوب کہا اور اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو صف اول کے مرثیہ نگار ہوتے لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی فراستؔ کے گھر کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ عارجؔ کے مراثی میں سادگی، شگفتگی اور رعنائی بیان کے عناصر کافی نمایاں ہیں۔ انہیں منظر کشی سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے مرثیوں میں بہار کی کیفیات یا صبح وشام کے مناظر شدت سے موجود ہیں:

Scanned with CamScanner

وہ ہوا سرد وہ رنگ چمنستان سحر
خوبیِ صنعت معبود پہ قرباں ہے نظر
چرخ پہ تاروں کا جھرمٹ ہے نہ روشن ہے قمر
مثلِ انجم کے شگفتہ ہیں زمیں پر گلِ تر

بے نشاں ہو گئے جو چرخ پہ تھے گل بوٹے
پھر عنادل نے مزے آ کے چمن کے لوٹے

بال و پر جھاڑ کے مرغانِ چمن چہکارے
وہ شجر ڈوبے ہوئے رنگ میں پیارے پیارے
لالہ پر قطرۂ شبنم کے ہوئے نظارے
ہوا دھوکہ، کہ چمکتے ہیں فلک پر تارے

قدرت مالک کونین نظر آتی ہے
حمد حق کرتی ہوئی باد سحر آتی ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا کہ:

''عارجؔ نے صرف دس مرثیے کہے لیکن ان کا ہر مرثیہ اچھا، شگفتہ اور دلکش ہے، زبان شستہ، صاف اور شیریں ہے، تخیل پاکیزہ اور بندشیں چست ہیں، مصائب بھی کافی پر تاثیر نظم کئے ہیں جس کے نتیجے میں مراثی میں درد و سوز کا عنصر بھی کافی نظر آتا ہے۔'' ۵۷

عارجؔ زید پوری کو تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے حسینیہ میر فراست حسین فراست مرحوم کے لئے تاریخ کہی:

طلب بکن گہر مدعا ز صاحب قصر — دریگانۂ دریائے مجمع البحرین

شد آفتاب رسالت شریک بزم عزا — ز قصر خلد بہ ماتم سرائے نور العین
نوشتہ خامۂ عارجؔ بسال تعمیرش — ببیں شکوہ عزا خانۂ امام حسینؑ

۱۳۳۹ھ

عارجؔ زید پوری نے زوجۂ اولیٰ عارفۃ الزہرا بنت سید محمد زائر کے انتقال پر ملال پر قطعۂ تاریخ نظم کی تھی:

ہوتا کسی علاج سے کس طرح فائدہ — تھی زندگی نہ پیر و بنت رسولؐ کی
بائیسویں برس میں سدھاری پدر کے پاس — حسرت بھری وفات ہوئی دل ملول کی
لڑکی جو پانچ ماہ کی تھی وہ بھی چل بسی — رخصت ہوئی سیوم کو یہ فرقت قبول کی
پر نور باغ خلد خدا نے عطا کیا — حاجت چراغ کی ہے لحد کو نہ پھول کی
بتلا رہا ہے مصرع عارجؔ سن وفات — رحلت ہوئی جہاں سے کنیز بتول کی

۱۳۴۳ھ

اس تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عارجؔ کو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن میں بھی کمال حاصل تھا۔

Scanned with CamScanner

منتصر حسین منتصرؔ

منتصرؔ زید پوری اکملؔ زید پوری کے بڑے صاحبزادے اور یونسؔ کے شاگرد تھے۔ منتصرؔ اپنے عہد کے سب سے بڑے ہرثیہ گو اور مزاح نگار ہیں ان کی ہرثیہ گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''ہرثیہ کو تہذیب و شرافت کے دائرے میں لے آنے کا سہرا سخنورؔ کے سر ہے لیکن اسے ایک اعلیٰ صنف بنا دینے کی سعی پہلی بار منتصرؔ نے کی ہے''۔ ۵۸

منتصرؔ کا شعر و سخن کا ذوق فطری تھا، پھر سارا خاندان شاعر، اس لئے منتصرؔ نے بھی ابتدائے عمر سے شاعری پر توجہ دی، اپنے حقیقی چچا یونسؔ زید پوری کی شاگردی اختیار کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں کافی مشق بہم پہنچائی، ایک بند میں اپنے اس شاعرانہ ماحول کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

پدر خلد مکاں سے جو بلاغت پائی
عم مرحوم سے شوخی طبیعت پائی
فیض سے میں نے مغوصؔ کے فصاحت پائی
کرم بیخودؔ مغفور سے ندرت پائی
یوں عطا چار نے بالغ نظری فرمائی
فن میں یونسؔ نے مری راہبری فرمائی

ساقی نامہ ہرثیہ کا جزو لاینفک ہے اور میاں مشیرؔ کے وقت سے رسم قائم ہے کہ

ہرثیہ میں ساقی نامہ ضرور ہوتا ہے، منتصرؔ نے بھی اس رسم کی پابندی کی ہے لیکن ان کا ساقی نامہ مراثی کے ساقی ناموں سے ٹکر کھاتا ہوا نظر آتا ہے:

پہلے ازل سے جو ہوئی تیار وہ شراب
آب بقا کے جس میں ہیں اسرار وہ شراب
تلچھٹ ہے جس کی رحمت غفار وہ شراب
کشتی ہو جس سے حشر کے دن پار وہ شراب
ہر گھونٹ جس کا پی کے طہارت ہو روح کی
اک دن اُبل رہی تھی جو کشتی میں نوح کی

جس مے میں رحمت صمدی حل ہے وہ شراب
قدرت کے میکدے میں جو اول ہے وہ شراب
قرآن جس کی مدح مکمل ہے وہ شراب
جودیں کے ہر اصول سے افضل ہے وہ شراب
پینے پلانے جاؤں نہ بیت الحرام میں
ہفتاد حج کا لطف ملے ایک جام میں

منتصرؔ نے ساقی نامہ کے ایک بند میں اصول دین کو جمع کر دیا ہے:

وہ مے ہو جو آغاز میں وحدت کا پتہ دے
پیمانہ سے میزان عدالت کا پتہ دے
جبتک رہے شیشہ میں نبوت کا پتہ دے
تقسیم اگر ہو تو امامت کا پتہ دے
پی کر جسے ساقی کی کرامت نظر آئے
وہ مے ہو جو چھلکے تو قیامت نظر آئے

منتصرؔ نے ایک ہرثیہ میں کم سواد شعرا کا تذکرہ بڑے مزے سے کیا ہے:

Scanned with CamScanner

کیا ضروری ہے کہ ہر سر میں ہو سودائے سخن
گنگ جتنے ہیں وہ کرنے لگیں سودائے سخن
لولے لنگڑے بھی بنیں بادیہ پیمائے سخن
جس کے داڑھی ہو کہا جائے وہ بابائے سخن

طول داڑھی کا جو معیار ہو بیڈھب ہو جائے
بکرے چلائیں تو دیوان مرتب ہو جائے

مدح کے میدان میں منتصرؔ کسی سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ نوحوں، سلاموں اور قصائد کے علاوہ انہوں نے تین مرثیے بھی کہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل میدان ہر ثیہ گوئی ہی ہے اور انہوں نے ہر ثیہ کو منزل کمال تک پہنچایا اب یہ صنف رو بہ زوال ہے لیکن زید پور میں یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان کے غیر مطبوعہ مراثی بقول سید محمد منیف سلمہ ان کے ورثا کے پاس موجود ہیں۔ شاید اللہ انہیں توفیق عطا فرمائے کہ اس با کمال شاعر کا کلام محفوظ ہو جائے۔ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی (پاکستان) کے ذخیرۂ مراثی میں ان کا ایک مرثیہ محفوظ ہے۔ مرثیہ کا مطلع ہے:

زنداں سے جب حسینؑ کے اہل حرم چھٹے
بے کس عزیز مردہ اسیران غم چھٹے
مدت کے بعد حامل رنج والم چھٹے
زینب پکاری قید سے لو بھائی ہم چھٹے

تم تک پھر آنے والے ہیں سب کا سلام لو
اپنی بہن کا دور سے بھیا سلام لو

اور مرثیہ کا مقطع ہے:

بس منتصرؔ خموش دعا کا ہوا اہتمام
حلال مشکلات ہے بنت علیؑ کا نام

احسان مند کیوں نہ ہوں ہم باوفا غلام
شبیر کی بہن کے ہیں ممنون نو امام

مشکور سعی زینب زہرا لقب ہوئی
پھر آل مصطفیٰ سے نہ بیعت طلب ہوئی

منتصرؔ زید پوری شہید ثالث قاضی سید نور اللہ شوستری کے مزار کی نگہبانی پر مامور تھے اور وہیں ۱۹۸۵ء میں وفات پائی۔

Scanned with CamScanner

غلام عباس ناصرؔ

جدید مرثیے کے ارتقا میں ناصرؔ زیدپوری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں فراستؔ زیدپوری اور مرزا محمد طاہر رفیع سے تلمذ تھا بعد میں خود بھی کثیر التلامذہ استاد تسلیم کیے گیے۔ ان کا کلام اصلاحی، تبلیغی اور زمانۂ حال کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ناصرؔ (یکم جنوری ۱۹۱۵ء تا ۱۹۶۶ء) نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۵ء میں لکھا جبکہ انکی عمر بیس سال کی تھی۔ ان کے مرثیوں کی تعداد ذاکر حسین فاروقی نے ۱۰۵ بتائی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''وہ نجم آفندی کی تحریک اصلاح و تجدد سے کافی متاثر ہیں اور مرثیے سے تعمیر ملت و تعمیر سیرت کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک محمدؐ و آل محمدؐ کی ذوات مقدسہ کا مقصد زندگی یہ تھا کہ کچلی ہوئی اور پسماندہ انسانیت کو اوج و رفعت سے ہمکنار کیا جائے اور ایک ایسا عظیم فکری و روحانی انقلاب لایا جائے جو بشر کو شر سے پاک کر کے خیر محض سے تبدیل کر دے یہی وہ مرکزی تصور ہے جو ان کے مرثیوں کی جان ہے''۔ ۵۹

ناصرؔ زیدپوری کے مرثیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ مرثیے جو واقعات سے متعلق ہیں اور دوسرے ایسے مرثیے جن میں معصومین کے فضائل و مناقب بیان

کیے گئے ہیں۔ رثاء کے جدید انداز کا اثر ناصر کے یہاں کافی حد تک موجود ہے چنانچہ ایک مرثیہ میں انہوں نے شہادت کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کی توضیح اس طرح کی ہے:

خلد سے باغ شہادت میں ہوا آتی ہے
اصل میں جو ہے بقا بعد فنا آتی ہے
دیدۂ دل کو نظر شان خدا آتی ہے
کہ حیات ابدی بن کے قضا آتی ہے
جان دے دیتے ہیں خالق کی رضا کی خاطر
وہی زندہ ہیں جو مرتے ہیں خدا کی خاطر

ایک بند میں حضرت امام حسینؑ سے انہیں جو والہانہ عقیدت مندی ہے اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

وفا کا نام کیا ما سوا کا کام کیا
بس ایک دن میں تمام انبیاء کا کام کیا
کبھی رسولؐ کبھی مرتضیٰؑ کا کام کیا
خدا کا بندہ تھا لیکن خدا کا کام کیا
یہی سبب ہے شہِ مشرقین ہو نہ سکا
جہاں میں کوئی جواب حسینؑ ہو نہ سکا

ناصرؔ زیدپوری نے بیشمار مرثیے کہے لیکن ان میں سے ایک بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہیں آیا۔ نتیجتاً مرثیوں کے جو بند کہیں چھپ گیے بس وہی اثاثہ لوگوں کے سامنے ہے مگر وہ بھی اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے دکن کے ہفت روزہ 'انیس' (۱۹۵۳ء) کے حوالے سے کچھ بند پیش کیے ہیں جن سے ان کی فکر کا اظہار ہوتا ہے:

دیکھ لے پہلے نگاہوں میں اثر ہے کہ نہیں
سوچ لے پہلے کہ سینہ میں جگر ہے کہ نہیں

Scanned with CamScanner

ہے وہ سردار جو سمجھے کہ یہ سر ہے کہ نہیں
جان ہے مال ہے اولاد ہے گھر ہے کہ نہیں
انقلابات کی تصویر ہو دل سینے میں
روزِ منہ دیکھتا ہو موت کے آئینے میں
مرنے والے یہ سمجھتے نہیں قوت کیا ہے
دل کے جذبات دبالے کوئی طاقت کیا ہے
حق پہ غالب ہو یہ باطل کی حقیقت کیا ہے
زورِ شمشیر ہے کیا زورِ حکومت کیا ہے
قسمتیں جاگتی ہیں اُن جگر افگاروں کی
نیند آتی ہو جنہیں چھاؤں میں تلواروں کی
عشق کی سرحد آخر ہے شہادت بہ خدا
ختم ہوتی ہے جہاں منزلِ تسلیم و رضا
ڈوب کر خون میں بڑھتا ہے جمالِ شہدا
سر جو بالائے سناں ہو تو ہے معراجِ وفا
رفعتِ قدر و شرف عرش سے ٹکراتی ہے
شانِ ہی اور شہیدوں کی نظر آتی ہے

ناصر آلِ رسول کے فلسفۂ زندگی اور ان کے کردار و عمل کی فکری و حکیمانہ انداز میں شرح کرنا ایک مرثیہ گو کا پہلا فرض تصور کرتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اکثر مراثی میں ایسے مباحث چھیڑے ہیں جن پر مرثیہ گو حضرات بہت کم توجہ صرف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مرثیہ میں صلح حسن کے اسرار و رموز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صلح حدیبیہ سے نہیں کم حسنؑ کی صلح
ہے مقصدِ پیمبرِ اعظمؐ حسنؑ کی صلح

ہے زخم اضطراب کا مرہم حسنؑ کی صلح
شبیر کا ہے فلسفۂ غم حسنؑ کی صلح
صدمے اٹھائے دین اور ایمان کے لیے
دل پارہ پارہ ہو گیا قرآن کے لیے
کہتے ہیں بے خبر یہ شجاعت کے ہے خلاف
صلح حسنؑ مصالحِ امت کے ہے خلاف
یہ اعتراض انکا حقیقت کے ہے خلاف
یہ اسوۂ نبیؐ و امامت کے ہے خلاف
افعالِ مرسلین پہ ان کی نظر نہیں
اسلام کے اصول سے وہ باخبر نہیں
ہوتا نظر کے سامنے گر اسوۂ نبیؐ
یہ اعتراض پھر کبھی کرتے نہ اُمتی
تیرہ برس خموش رہی کیوں پیمبری
نکلی نہ کیوں نیام سے شمشیرِ حیدری
ظاہر کیا یہ راز شہ مشرقین نے
مجبور ہو کے تیغ اٹھائی حسینؑ نے
پہلی ہی شرط تھی کہ شریعت پہ ہو عمل
اللہ کے رسول کی سیرت پہ ہو عمل
یعنی تصورات حقیقت پہ ہو عمل
آئین اور اصولِ نبوت پہ ہو عمل
ثابت یہ کر دیا ہمیں مقصد عزیز ہے
دینِ خدا و دینِ محمدؐ عزیز ہے

Scanned with CamScanner

آل رسولؐ کا تو نظریہ ہی اور ہے
جوان کے دل میں ہے وہ تمنا ہی اور ہے
ان کی حیات و موت کا منشا ہی اور ہے
یہ راستہ ہی اور، یہ دنیا ہی اور ہے
ملتا نہیں پتا کہیں ذاتی مفاد کا
وہ دور صلح کا ہو کہ عالم جہاد کا

بہت سے حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جس طرح امام حسینؑ نے جہاد کیا اسی طرح امام حسنؑ نے جہاد فرما کے قربانی کیوں نہیں دی۔ ناصر زید پوری نے اس کا مدلل جواب دیا:

مقصد کے اعتبار سے دونوں ہی ایک تھے
دو ساز معرفت ہیں کہ جنکی ہے ایک لے
بدلے ہوئے ہیں جام مگر ایک ہی ہے مے
بس ایک ہی حقیقت صلح و جہاد ہے
آمادہ صلح پر تھے شہ مشرقین بھی
روکے ہوئے تھے تیغ کو پہلے حسینؑ بھی
لیکن وہاں تو صلح کا امکان ہی نہ تھا
بیعت طلب امام سے تھا بانی جفا
مفہوم صلح سے نہیں کچھ اس کو واسطہ
چھڑتا اگر حیات حسنؑ میں یہ مسئلہ
دنیا جہاد حیدر کرار دیکھتی
قبضہ میں اس جری کے بھی تلوار دیکھتی

رسولؐ و آل رسولؐ کے فلسفۂ حیات کی تشریح و تعبیر نے ناصر کے مراثی میں ایک جدت اور ایک خاص گہرائی پیدا کر دی ہے۔ امام کی شہادت کا بیان گریہ خیزی کے لیے

ہوتا ہے لیکن ناصر اس المیہ میں بھی حیات ملی کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور یہ ان کی مرثیہ گوئی کا ایک ایسا پہلو ہے جس نے ان کو جدید مرثیہ گو شعرا میں ایک نمایاں مقام کا مالک بنا دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

مودت مہدی مودت

مودت زیدپوری قصیدہ اور غزل کے مشہور شاعر ہیں۔ فراست سے تلمذ تھا۔ ان کے قصائد محافل میں راقم سطور نے بارہا سنے ہیں شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا اس لئے مراثی و سلام کہنے لگے۔ ان کا کلام اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا تھا لیکن بیشتر کلام منتظر اشاعت ہے۔ ان کا ایک سلام۔ ع۔ ماتم شبیر سے قائم ہے شان زید پور۔ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

فراست جیسے باکمال استاد نے شاگرد پر پوری توجہ دی جس کے نتیجہ میں زید پور کے اچھے شعرا میں شمار کیے جانے لگے۔ مراثی بہت مختصر ہوتے ہیں اور بالعموم ان شہدا کے حال میں مرثیہ کہتے تھے جن کے حالات میں مراثی اب تک نہیں کہے گئے تھے یا کہے گئے تو بہت کم۔ دبستان دبیر میں ذاکر حسین فاروقی نے صرف دو بند بطور مثال پیش کیے ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جن میں حضرت عون بن علی کی لاش پر حضرت معصومۂ کونین کے بین نظم کیے ہیں:

فدا پسر پہ ہوا میرے تجھ پہ میں قرباں
ہزار حیف نہ دی باغیوں نے تجھ کو اماں
قلم کیا تجھے باغ علی کے سرو رواں
نثار فاطمہ ام البنیں کے راحتِ جاں

تمہارے مرنے کی جس دم خبر وہ پائے گی
وطن میں مادر ناشاد مر ہی جائے گی
ہوئی نہ پہلوئے عباس میں لحد کی بنا
ترا مزار مبارک بنا یہاں تنہا
ہے رونے والا نہ کوئی بھی حسرتوں کے سوا
ترے مزار پہ ارمانوں کا ہوا پہرا
یہ کیا کہ چھوڑ دیا ساتھ سارے لشکر کا
نصیب قرب نہ تجھ کو ہوا برادر کا

مودت نے متعدد نوحے کہے ہیں انہوں نے ایک ترجیعی نوحہ علی عباس زید پوری کی وفات پر کہا تھا جس میں دعائیہ انداز ہے:

خلد بریں میں وہ علی عباس دیکھیں گے — تاثیر جو زیارت کرب و بلا کی ہے
مرحوم کا مکاں پس قبر حسین ہو — بس التجا یہی دل درد آشنا کی ہے

اس کے علاوہ مودت نے اپنے استاد فراست کی وفات پر ترجیعی نوحہ کہا جس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

بزم عزا آپ کی غم میں ہے استاد کے — نظم جو کرتا رہا حال شہادت حسینؑ
بعد فنا بھی رہی آپ سے وابستگی — پیش ضریح و علم قبر فراست حسینؑ

کلک مودت پہ لکھا از پئے سال وفات
سایۂ طوبیٰ میں ہے صدر فراست حسین

مودت زیدپوری نے ۱۲ر صفر ۱۴۱۹ھ مطابق ۸ر جون ۱۹۹۰ء کو اپنے وطن زید پور میں انتقال فرمایا۔ وفی زیدپوری نے تاریخ کہی:

مرقد پہ وفی عیسوی میں لکھدو یہ مصرع
مداح اہل بیت مودت کی ہے تربت (۱۹۹۰ء)

Scanned with CamScanner

محمد ضامر، ضامؔر

سید محمد زائرؔ کے فرزند، فراستؔ کے بھتیجے اور نواس داماد، شاعری میں فراستؔ سے تلمذ تھا۔ مراثی کا نمونہ تو پیش نظر نہیں لیکن ایک مسدس (بشان حضرت علی اکبر) کے چند بند جناب سید محمد رضا عابد کی وساطت سے موصول ہوئے ہیں:

اے قلم مدحت اکبر سے سرافراز ہوں پھر
نغمۂ بلبل خوش لحن کا دم ساز ہوں پھر
مثل بوئے گل تر مائل پرواز ہوں پھر
شوق سے طائر سدرہ کا ہم آواز ہوں پھر
اتنی پُر کیف صدائیں ہوں کہ پیار آجائے
پھول مضموں کے کھلیں تازہ بہار آجائے

دل دیوانہ مرا جھوم کے ہو پھر دل ریز
مست ہے فکر کا تو سن اسے کرنا ہے تیز
میرے احباب کا اصرار ہے اس کی مہمیز
کسی میدان میں پیچھے نہ رہے وقت ستیز
وہ طرارے ہوں کہ میدان ترے ہاتھ رہے
کوئی پیچھے کوئی آگے کوئی پھر ساتھ رہے

ساقیا جلد اٹھا جام و سبو دیر نہ کر
خلد میں لطف عطا ہے دل میکش مضطر
پیکر ذوق طلب میں ہوں بنا سرتاسر
کر مرے حال پہ بھی لطف و عنایت کی نظر
دامن صبر جو ہاتھوں سے چھٹا جاتا ہے
در میخانہ پہ میخوار لٹا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

کنیز فاطمہ

دبستان دبیر کے حوالے سے زید پوری شاعرات میں کنیز فاطمہ کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ کنیز فاطمہ مولانا علی ضامن کی پوتی ہیں۔ عزاداری میں انہماک رکھتی ہیں۔ کئی مرثیہ اور لاتعداد نوحے کہے ہیں۔ سردست ان کے مراثی زیرِ نظر نہیں ہیں لیکن ان کے ایک نوحے کے چند شعر نذرِ قارئین ہیں:

کعبہ سے شاہ دیں کی جدائی قریب ہے
مقتل سے اپنے حق کا فدائی قریب ہے
کرب و بلا میں جا کے لٹی خواہر حسینؑ
ہو بے ردا وہ غم کی ستائی قریب ہے
تنہا وکیل شاہ ہے کوفہ میں ان دنوں
ہونے کو اہل کیں کی چڑھائی قریب ہے

محمد محسن، محسنؔ

محسنؔ زید پوری فراستؔ اور یونسؔ کے ایسے لائق و فائق شاگرد ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی میں اپنے اساتذہ کا نام روشن کیا۔ محسنؔ زید پوری کا تعلق زید پور کے ایک تعلقدار گھرانے سے ہے۔ ان کے جد خان بہادر سید خادم حسین (۱۷۷۸ء تا ۱۸۰۹ء/۱۱۹۲ھ تا ۱۲۲۴ھ) نامور رئیس تھے جن کے دادا سید سبز علی سلطان احمد شاہ (بعہد ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء/۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) کے دربار میں منصب چار صدی پر فائز تھے اور والد سید نوازش علی عہد غندر جنگ (۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء) کے حاکم تھے۔ خود خادم حسین کمسنی میں یتیم ہو گئے لیکن بڑے ہو کر سدھور کے ناظم ہوئے۔ حکومت وقت کے سرکش راجہ سورج پور کو شکست دینے اور حاضر دربار کرنے کے عوض نواب سعادت علی خاں بعہد (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) نے انہیں خطاب خان بہادر، خلعت اور تلوار بخشی۔ ان کی محل سرا زید پور کے محلہ پچھلی میں واقع ہے اور بڑی سرکار کے نام سے موسوم ہے اسی احاطہ میں ان کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے۔ انہوں نے ایک عالی شان امامباڑہ بنایا جس کی تاریخ ہے:

بنائے طیبہ اش خادم حسین نہاد ۶۱

۱۲۲۳ھ

ان کے بیٹے سجاد حسین ہرُ ہرُ پور ضلع بہرائچ کے چکلہ دار تھے۔ سجاد حسین کے بیٹے بنیاد حسین (تعلقدار)۔ (۲/شوال ۱۲۵۱ھ مطابق ۸/مئی ۱۸۳۶ء۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ

Scanned with CamScanner

مطابق جولائی ۱۹۰۳ء) زید پور کے مقتدر رئیسوں میں تھے۔ان کی عظمت یا شہرت کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کا خاندان، محل سرا اور امام باڑہ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ نانیہالی تعلقہ بھان مئو تعلقہ میں ملا تھا۔انہیں آنریری اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے دیوانی وفوجداری کے اختیارات حاصل تھے۔ بڑے روادار تھے۔انہوں نے اہل ہنود کے لئے پختہ مندر بنوانے میں مدد کی اور دسہرہ کا میلہ اپنی کدوکاوش سے لگوایا۔دسہرہ کے جلوس کے لئے اپنا سامان بھی دیتے تھے۔ بڑے محب اہلبیتؑ تھے۔ان کے بیٹے اعتضاد حسین کو اپنے ماموں امجاد حسین (۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء۔۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء) جو کہ لاولد تھے ان کا بھی تعلقہ ملا۔اس طرح اعتضاد حسین کو سہیل پور اور بھان مئو کا مشترکہ تعلقہ ملا۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء کو وفات ہوئی۔انہیں آنریری منصف کے اختیارات حاصل تھے۔ان کے بیٹے استعداد حسین تھے جو کہ باپ ہی کی زندگی میں وفات پا چکے تھے۔حافظ رحمان ان کا تاریخی نام تھا۔مذہب سے خصوصی لگاؤ تھا۔۱۳۴۱ھ میں انتقال ہوا۔یوسؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

سروش گفت بہ یوسؔ برائے سال وفات
بیافت جا بجناں سید استعداد حسین
۱۳۴۱ھ

اقبال حسین (۹/رجب ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء۔۲۰/جمادی الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء) عبداللہ پور، بھان مئو، سہیل پور، صفدر گنج اور زید پور کے تعلقہ دار ہوئے۔ حکومت سے اعزازی منصف کے اختیارات ملے۔آپ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ صوبۂ اودھ کے تمام تعلقہ دار شریک ہوئے۔راجہ صاحب محمود آباد نے سہرا باندھا۔نکاح باقر العلوم مولانا سید محمد باقر صاحب اور حکیم مولوی سید امداد حسن صاحب نے پڑھا۔عتبات عالیات کی زیارت سے تین بار مشرف ہوئے۔ اپنے خاندانی امامباڑہ کی توسیع وتزئین کی۔کتابوں کے شوقین تھے اور خاندانی کتب خانے میں نایاب کتابوں کا اضافہ کیا۔صاحب اولاد نہ تھے اس لئے ریاست کا انتظام دونوں بھائی سید بنیاد حسین اور

سید اضاعت حسین کے سپرد ہوا۔

محسؔن زید پوری بنیاد حسین تعلقدار کے منجھلے بیٹے سید مستفاد حسین کے منجھلے صاحب زادے تھے۔محسؔن کے نانا سید ضامن حسین (م ۱۳۳۸ھ/۲۰۔۱۹۱۹ء) مشہور شاعر ثبؔت زید پوری کے نواسے اور میر سخاوت حسین کے فرزند تھے اور فراسؔت جیسے نامور فرزند کے باپ۔فروغؔ سیتا پوری کے لفظوں میں:

''وہ نہایت ہی نیک نفس اور قانع اسلاف اور سلسلۂ انساب سادات زید پور سے بہت ہی باخبر، دستورات و مراسم ضروری مابین سادات کے محقق اور ہر دل عزیز، تمام اہل برادری کے خدمات کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔''

ان کے تین بیٹے فراسؔت، نفاسؔت اور زائرؔتینوں شاعر تھے۔ضامؔن نے ۱۳۳۸ھ میں انتقال کیا۔یوسؔف زید پوری نے نثر میں تاریخ کہی:

ضامن حسین رحمہ اللہ (۱۳۳۸ھ)

محسؔن کے بڑے بھائی الحاج سید عابد رضا جج (۱۵/ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ مطابق جولائی ۱۸۹۱ء۔۱۲/ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق جولائی ۱۹۶۵ء) زید پور کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایم۔اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔۱۳۳۸ھ میں عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے۔یوسؔف زید پوری نے تاریخ کہی:

عابد رضا منصف (۱۳۳۸ھ)

بہت جلد ترقی کر کے لکھنؤ کے جج خفیفہ مقرر ہوئے۔ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن میں رہے۔زراعت کا بھی شوق تھا اور اپنی نانیہالی جائداد میں مزید اضافہ کیا۔خوش خطی اور نقشہ کشی میں فرد تھے اس کا نمونہ ان کے خاندانی امام باڑہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔حج بیت اللہ دوبار کیا۔عتبات عالیات کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔وطن میں انتقال کیا۔ سردار مہدی زید پوری نے تاریخ کہی:

Scanned with CamScanner

عابد رضا ساکن جنت باش ۶۲ھ

۱۳۸۵ھ

محسن زید پوری ۶۳ (۷/رجب ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۳/نومبر ۱۸۹۸ء۔ ۳۰/ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۲/جنوری ۱۹۸۶ء) کی مکتبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی ریاست حسین سے قرآن مجید اور یونس زید پوری سے اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال حسین (تعقلدار) کی فرمائش پر انتظام ریاست میں مشغول ہوئے اور یہ سلسلہ خاتمۂ زمینداری تک قائم رہا۔ محسن کی شادی خاندان ہی میں میر احماد حسین کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی ایک فرزند سید شہزاد حسین اور دو صاحبزادیاں خداوند کریم نے عطا کیں۔ شہزاد حسین کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ قصیدہ، نوحہ، سلام اور قطعات تاریخ خوب کہتے تھے۔

محسن مرثیہ نگاری میں اپنے ماموں اور دبستان دبیر کے سربرآوردہ استاد فراست زید پوری کے شاگرد ہیں۔ فرید مہدی رضوی نے انہیں شاعری میں یونس کا بھی شاگرد بتایا ہے اور ثبوت میں محسن کے قطعۂ تاریخ کا یہ شعر پیش کیا ہے:

نظم من افسوس از اصلاح او محروم شد — اہل علم، اہل سخن، اہل قلم یونس حسین

فراست سے یہ سلسلہ تلمذ پختہ عمر میں شروع ہوا اور ان کی حیات تک جاری رہا۔ شاگرد کے مذاق شعری اور جوہر قابل کو دیکھ کر استاد نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حقیقی بھانجے تھے ہی۔ فراست مرحوم نے رموز فن اس طرح تعلیم کیے جیسے کبوتر اپنے بچوں کو دانا بھراتا ہے۔ مختصری مدت میں ان کا شمار اچھے شعرا میں ہونے لگا۔ محسن نے بھی شاگردی کا حق ادا کیا۔ ۱۳۶۰ھ میں جب محسن نے یہ مرثیہ رقم کیا سرافراز علم کل کے شہنشاہ کا ہے۔ کہا تو یہ رباعی بھی کہی:

ممدوح سے مدحت کا صلہ ملتا ہے — کم کیا ہے توقع سے سوا ملتا ہے
کوشش تو بہت کی ہے یہ دیکھیں محسن — انعام میں استاد سے کیا ملتا ہے

اور جب یہ رباعی اور مرثیہ فراست نے دیکھا تو بطور انعام یہ رباعی کہی:

اس مرثیے کی کیا ہو ثنا اے محسن — انعام میں دیتا ہوں دعا اے محسن
در بند نہ یہ بعد فراست ہوگا — امید یہی ہے مرحبا اے محسن

فراست کی دعا اور فیض تربیت کے نتیجے میں محسن نے تھوڑے ہی عرصے میں استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا اور آگے چل کر وہ جانشین فراست کے لقب سے یاد کئے گئے۔ محسن نے فراست کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا اور استاد نے جو استادانہ ریاض کیا تھا شاگرد نے اس کا حق بھی ادا کیا:

زباں پہ مدح شہنشاہ خوش نہاد رہے
سخن کی بزم میں جو ہو وہ با مراد رہے
سبق جو دے گئے استاد ہم کو یاد رہے
الٰہی روح فراست ہمیشہ شاد رہے

چمن سے لے گئے ساتھ اپنے رنگتیں گل کی
خزاں میں کون سنے گا فغانیں بلبل کی

ادنیٰ ہوں ایک خادم سلطانِ ارجمند
بہر ثواب کہتا ہوں مشکل سے چند بند
پایا تھا فن شعر میں استاد کیا بلند
جن کا کلام ہر کس و ناکس کو ہے پسند

اپنے زمانے کے وہی حسان نظم تھے
گویا مدرسِ ادبستان نظم تھے

فراست سے اپنی قرابت داری، کثیر التلامذہ ہونے اور ان کی زود گوئی اور پرگوئی کا اعتراف بھی محسن کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

تعمیر نظم و مدح کی بنیاد بھی وہ ہیں
قابل ثنا کے مستحق داد بھی وہ ہیں

Scanned with CamScanner

وجہ تسلیِ دل ناشاد بھی وہ ہیں
ماموں بھی میرے اور مرے استاد بھی وہ ہیں

شاگرد اتنے ہیں کہ بہم انجمن ہوئی
ان کا کلام سن کے تمیز سخن ہوئی

پرگو ہیں ایسے آپ ہی وہ آپ ہیں مثال
حیراں ہو عقل لکھوں فراست کا گر کمال

گھر سے چلے زیارت شہ کو وہ خوشخصال
کیسا حضر سفر میں تھا تصنیف کا یہ حال

تھا ذہن کربلائے معلیٰ کی راہ میں
چھ مرثیے طویل کہے چند ماہ میں

محسنؔ نے تین مرتبہ عتبات عالیات کی زیارت کی پھر بھی ان کی خواہش ہے کہ درِ حسینؑ پر پھر حاضری کا شرف حاصل ہو جائے اس لئے چوتھے سفر کی دعا اس انداز میں کرتے ہیں:

ہوا ہے بزم غم شہ پہ رنج و غم کا اثر — دو نیم ہو گیا محسنؔ ہر اک کا قلب و جگر
دعا خدا سے کرو تم یہ مرثیہ پڑھ کر — الٰہی بار چہارم ہو کربلا کا سفر
ملے جو قرب حر ذی شعور کیوں آؤں
درِ حسینؑ سے پھر زید پور کیوں آؤں

ان مشاہد مشرفہ پر حاضری کے دوران بھی مرثیہ گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ سلطان العرب والعجم امام غریب الغرباء حضرت علی رضاؑ کے روضہ مقدس کی زیارت کے تاثرات نظم فرمائے ہیں۔ وفور عقیدت کے ساتھ ساتھ حسنِ نظم بھی قابل دید ہے:

بجا ہے جتنا کرے افتخار میرا نصیب
کہ پہنچا تا بہ در دولتِ امام غریب

غنی فقیر ہوا پائیں دولتیں وہ عجیب
قریب شاہ تھا میں اور جناں تھی میرے قریب

نظر کے سامنے تھا اوج و پایۂ طوبیٰ
تھا سر پہ گنبد اقدس کا سایۂ طوبیٰ

ہے روضۂ دل دلبند بو تراب میں نور
زمانہ میں ہے نہ اتنا نہ آفتاب میں نور
بھرا ہوا ہے ضریح فلک جناب میں نور
لحد میں ہے وہ رخ پاک یا نقاب میں نور
کسی میں تاب نہیں ہے اسے جو دیکھ سکے
یہ نور وہ ہے کہ موسیٰ نہ اس کو دیکھ سکے

محسنؔ نے عتبات عالیات کی زیارتیں تو کیں لیکن حج سے محرومی کی کسک انہیں بارہا ستاتی رہی۔ درج ذیل بند کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حج جیسے فریضے کی ادائیگی میں بھی ہر زمانے میں دلالی کی جاتی تھی:

حج ادا کرنے کی درخواست جو دی تھی امسال
یہ جواب آیا جہازوں پہ جگہ اب ہے محال
متحیر ہوں کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا مآل
جن کے ہاتھوں مرے ارمان ہوئے یوں پامال
یہ غلط تھا کہ نہیں کوئی جگہ خالی تھی
حج کے دلال جو تھے ان کی یہ دلالی تھی

محسنؔ ایک اچھے خطاط بھی تھے۔ ۱۳۵۶ھ میں انہوں نے قرآن کی کتابت مکمل کی ایک مرثیے میں نصف قرآن کی کتابت کا تذکرہ ہے۔ یہ مرثیہ انہوں نے اپنے خانوادے کی ایک فرد آقا حسن کی فرمائش پر کہا تھا:

Scanned with CamScanner

تھی جو فرمائش آقا حسن نیک شیم
ہوئی پوری یہ ہے تائید خدائے اکرم
ختم کر مرثیہ کو محسن کوتاہ رقم
نصف قرآں ابھی لکھنے کو ہے فرصت بھی ہے کم
وہ بھی توصیف ثنائے شہ دلگیر میں ہے
سورہ والفجر کا کل مدحت شبیر میں ہے

اور جب قرآن کی کتابت مکمل کی تو ان کے استاد یونس زید پوری نے تاریخ کہی:

کام سب لیتے ہیں کلک دوزبان سے یونس — کام جو چاہیے وہ کام لیا محسن نے
دہن کلک سے تعریف سنیں اور تاریخ — قرآن یہ لکھا نام خدا محسن نے

۱۳۳۶+۲۰ — ۱۳۵۶ھ

محسن مرثیہ میں رثائیت کو جان سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مرثیہ کو خالص دینی صنعت کی صورت پروان چڑھنا چاہیئے۔ وہ شدت سے اس بات کے قائل ہیں کہ:

ہیں جو درکار فن مدح سرائی کے اصول — پڑھیے قرآن کی تفسیر احادیث رسولؐ

ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن احادیث نبویؐ اور اہلبیتؑ لازم وملزوم ہیں اسی لئے وہ جگہ جگہ تفاسیر واحادیث معصومینؑ کا سہارا لیتے ہیں۔ اس تناظر میں حضرت علیؑ کا تعارف محسن کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

علم کے شہر نبیؐ گر ہیں تو در حیدرؑ ہیں
ہوئے کعبہ میں جو پیدا وہ بشر حیدرؑ ہیں
اولیں دور امامت کے قمر حیدرؑ ہیں
مصطفیٰؐ ہیں اسی جانب کو جدھر حیدرؑ ہیں
وصف ہے کون سا احمدؐ کے جو بھائی میں نہیں
ایسا بندہ کوئی واللہ خدائی میں نہیں

فضائل ہوں یا مصائب وہ اپنا قدم آیات قرآنی، احادیث اور روایات صحیحہ کے دائرے سے باہر نہیں نکالتے اور خطیبانہ موشگافیوں اور شاعرانہ نکتہ آرائیوں، مبالغہ وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں:

ھل اتیٰ سے ہے عطا اور سخاوت ظاہر
وسقاھم سے ہوئی شان ستایت ظاہر
سورۂ مائدہ کرتا ہے امامت ظاہر
سورۂ واقعہ سے آپ کی وقعت ظاہر
انما آیا ہے اثبات ولایت کے لئے
اور اکملتُ لکم ان کی خلافت کے لئے

یا یہ اشعار:

پیش حق کب کوئی شئے ان کے برابر ٹھہری
ضربت اک طاعت کونین سے برتر ٹھہری
حیف اس پر جسے اتنا نہیں احساس تلک
آپ کا ذکر ہے اَلْحَمْدُ سے وَالنّاس تلک
پاؤں یہ دوش شہنشاہ رسالت پہ رہے
کعبہ میں جلوہ نما مہر نبوت پہ رہے

محسن اپنے مرثیوں میں روایات صحیحہ کو پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہیں۔ مرثیہ چونکہ اپنی تمام وسعتوں آفاقیتوں کے باوجود ایک مذہبی صنف سخن ہے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسمیں من گڑھت واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پروفیسر مسیح الزماں مرحوم نے اس کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”مرثیہ گویوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا۔ تاریخی اور نیم تاریخی باتوں کو اپنی جگہ رہنے دیا صرف خالی جگہوں میں رنگ بھر کر ان مرقعوں کو حقیقت سے زیادہ قریب کیا ہے“۔ نظم روایات میں تاریخی صحت کی پابندی میرو

مرزا مرحومین کے بعد ہی ملنے لگتی ہے لیکن یہ عنصر محسنؔ کے کلام میں بہت حد تک نمایاں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ منظوم تاریخ نہیں بن سکتا۔ بہر حال شاعر تاریخی حالات کی جستجو میں ہے۔ نظم تو نظم نثر میں بھی اسے کوتاہ دامنی کا احساس ہے:

جو امامت کے سوا عہد کا اپنے ہو علیؑ
حیف ہے اس کی مفصل کوئی تاریخ نہیں
نثر میں جبکہ نمایاں نظر آتی ہے کمی
نظم میں کیسے لکھی جائے سوانح عمری
پر یہ ہے فکر رسائی رہِ مدحت ہو
مجملاً حال ولادت سے شہادت تک ہو

جناب عباسؑ کی شخصیت واقعۂ کربلا میں ایک اہم مقام رکھتی ہے ان کی ولادت کی تاریخ کا تعین بھی محسنؔ نے روایات کو کسوٹی پر پرکھ کر کیا ہے، نیز ان مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے جو روضۂ جناب عباسؑ پر ان کی آنکھوں نے دیکھا:

ہجری چھبیسواں سن چارم شعبان کی تھی شب
پیدا یثرب میں ہوا جان و دل میر عرب
متفق اس پہ ہیں عالم نجف اشرف کے بھی سب
ان کی تحقیق پہ عامل کوئی کیوں کر نہ ہو اب
دیکھا اس شب کو گیا جشن کا ساماں ہوتے
میں نے بھی دیکھا ہے روضے پہ چراغاں ہوتے

محسنؔ بڑے ہی شیدائے عزاداری اور محبِّ اہلبیتؑ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو مرثیہ گوئی سے عشق تھا وہ مرثیہ گوئی کو اپنا فریضۂ دینی تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں خلوص کا عنصر شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ ہر غم پر غم اہلبیتؑ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حسینؑ کے ماتم داروں کو صرف غم حسینؑ سے واسطہ ہونا

چاہیئے۔

نہ میں ہوں مرثیہ گو اور نہ میں محقق فن
نہ قدر شعر ہے مجھ کو نہ ہے تمیز سخن
دعا یہ حق سے ہے بہر حسینؑ تشنہ دہن
عزا کی بزم سے اٹھے نہ مرثیے کا چلن
دل و دماغ فضائل سے باغ باغ رہیں
کبھی نہ مجلس و ماتم کے گل چراغ رہیں

چنانچہ ایک مرثیہ میں خاتمۂ زمینداری کا ذکر آ گیا تو کہتے ہیں:

جو ہیں جنت کے محق کیوں پئے دنیا روئیں
فائدہ کیا کہ زمینداری کا رونا روئیں

خاتمۂ زمینداری نے ان کو ان کی خاندانی جاگیر سے محروم کر دیا، پھر بھی ان کے دینی جذبہ نے ان کی مرثیہ گوئی میں ایک والہانہ جذب و اثر کی کیفیت پیدا کر دی۔ چنانچہ وہ مرثیہ گوئی کی بقا کے لئے دعا کرتے ہیں:

یا خدا مرثیہ گوئی کا چلن ختم نہ ہو
نکتہ داں ایسے بہم ہوں کہ یہ فن ختم نہ ہو
رونق محفل ارباب سخن ختم نہ ہو
ستم دست خزاں سے یہ چمن ختم نہ ہو
گلفشانی سے گلستاں نہ یہ مجبور رہے
واپس آ جائے بہار اور یہ خزاں دور رہے

محسنؔ مرثیہ گوئی کو سرمایۂ آخرت سمجھتے ہیں انہیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ دور حاضر کے شعرا مرثیہ گوئی پر توجہ نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنے عہد کے شعرا پر ایک والہانہ تنقید کی اور مرثیہ کہنے کی تلقین بھی:

Scanned with CamScanner

جن کی تصنیف میں ہے زور جوانی و شباب
وہ بھی کھو بیٹھے ہیں اب مرثیہ گوئی کا ثواب
مفت میں کر رہے ہیں زندگیاں اپنی خراب
کہنے کو مرثیہ کہئے تو یہ دیتے ہیں جواب
ہم کو فکر سحر و شام سے کب فرصت ہے
رات دن گردش ایام سے کب فرصت ہے

مرثیوں میں رثائیت کا عنصر کم ہو جانا محسن کے لئے تکلیف دہ ہے اس لئے کہ رثائیت ہی مآل مرثیہ ہے۔ احتجاج کا یہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

مدح گویوں نے کیا مرثیہ گوئی کو سلام
طرز یہ شہر کی مشہور مجالس میں ہے عام
ساقی نامہ ہی پر کر دیتے ہیں مجلس کو تمام
نہ مصائب نہ کوئی حال غم افزائے امام
دل ہوئے خوش مگر ایک آنکھ بھی پرنم نہ ہوئی
محفل مدح ہوئی مجلس ماتم نہ ہوئی

محسن نے جس دور میں مرثیہ گوئی شروع کی اس وقت ترقی پسند رجحانات مرثیوں میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں تھے لیکن اس کی جھلک ان کے مرثیوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ مراثی میں علمی، فکری اور عصری مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ اپنے مراثی میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مرثیوں میں نئے موضوعات و اسالیب کو داخل کیا جائے۔ چنانچہ مرثیہ گوئی کے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہیں جو کہ فخر زمن ناظمان خوش تدبیر
وہ اک حلقہ طرز کہن میں سب ہیں اسیر

دکھا گئے ہیں جو راہِ سخن انیس و دبیر
اسی لکیر کے سو سال سے بنے ہیں فقیر
بیاں کا طرز وہی نظم کا نظام وہی
کہ ہے شروع سے آخر تک انتظام وہی
وہی ہے مرثیہ کا چہرہ اور وہی صورت
وہی ہے تیغ کا دم گھوڑے کی وہی سرعت
وہی ہے رنگ طبیعت وہی ہے ذہنیت
وہی بہار و خزاں اور مناظر قدرت
زمانہ تیزیٔ رفتار سے کہاں پہنچا
ہمارا ذہن بھی اب تک نہیں وہاں پہنچا

یوں تو مرثیہ کی ہیئت پر سودا نے کئی تجربے کئے لیکن قبول عام مسدس کو ہوا۔ میر ضمیر کی اس ''طرز نوی'' جس نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں فنی حیثیت دی اور سراپا اور صف آرائی کو داخل کیا۔ بعد میں انیس و دبیر نے ضمیر کی اس بلند و بالا عمارت کو اس طرح آراستہ کیا کہ دنیا ان کی استادی و کمال فن کی معترف بن گئی۔ ان دونوں اساتذہ نے مرثیہ کو ایک خاص، ممتاز اور رفیع مقام دیا اور اسے غیر معمولی ادبی اہمیت کا حامل بنا دیا۔ انیس و دبیر کے بعد ان کے شاگردوں اور مرثیہ گو خانوادے کے دوسرے افراد نے اس صنف میں گل بوٹے کھلائے۔ جن سے زبان کی وسعت اور ان حضرات کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ چند فروعی ایجادات کے علاوہ مرثیہ انیس و دبیر سے آگے نہ بڑھ سکا اس کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا:

''ان مرثیہ گویوں کی تقلید پسندی نے انہیں کوئی نئی راہ نکالنے اور جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔'' ۶۴

محسنؔ نے بھی ان اساتذۂ فن کو نذرانہ خلوص پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اساتذہ اس لئے مرجعِ تقلید ہیں کہ وہ زمانہ کو طرز جدید کا درس دے گئے:

یہ دونوں مرثیہ گو واقعی تھے فرد فرید
نہ کی انہوں نے بھی طرز قدیم کی تائید
اسی سبب سے ہیں وہ آج مرجع تقلید
وہ دے گئے ہیں زمانے کو درس طرز جدید
وہ اپنے عہد میں گلہائے نو کھلا گئے ہیں
وہ لطف کُلِّ جدید لذیذ اٹھا گئے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ پیارے صاحب رشیدؔ ہوں یا دولہا صاحب عروجؔ، علی محمد عارفؔ ہوں یا میر وحیدؔ اپنی قادرالکلامی کے باوجود مرثیے کے روایتی حصار سے باہر نہیں نکل سکے۔ اس حصار کو بیسویں صدی میں جوشؔ نے توڑا اور جمیلؔ مظہری، آلِ رضاؔ، نسیمؔ امروہوی اور نجمؔ آفندی وغیرہ نے اس روش کو آگے بڑھایا۔ بعد میں ناصرؔ زید پوری، زائرؔ سیتا پوری، باقرؔ امانت خانی، قیصرؔ بارہوی، امیدؔ فاضلی اور وحیدؔ اختر نے اس روایت کو باقی رکھا۔ محسنؔ بھی ان شعراء کے دوش بدوش جدید مرثیے کے کارواں میں شامل ہوئے لیکن انہوں نے اپنے عہد کے دوسرے شعرا پر تنقید کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ ان کا نظریہ ہے کہ مرثیہ اس انداز کا ہو جو انفرادیت کا حامل ہو:

دل و دماغ کی آپس میں ہے یہ گفت و شنید
نہیں ہے مسئلۂ نظم لائق تقلید
ہے شوق اگر تو لکھو مرثیہ بطرز جدید
ادائے خاص سے مدح و ثنا کی ہو تمہید
خیال تازہ مضامیں کی جستجو میں رہے
نہ ہمنوائی کا انداز گفتگو میں رہے

ہر ایک سے ہو طریقہ بیاں کا بدلا ہو
کلام میں لب و لہجہ زباں کا بدلا ہو
زمیں کا رنگ سماں آسماں کا بدلا ہو
چلن روانی کا طبع رواں کا بدلا ہو
دکھائے مصرع دلکش کشش جداگانہ
ہے اپنے باغ سخن کی روش جداگانہ

محسنؔ کا خیال تھا کہ مرثیہ گوئی کا طرز یا اسلوب جداگانہ ہو، اس پر مستزاد یہ کہ کلام ایسا ہو کہ فنی اسقام سے پاک ہو:

وہ ہو طریقہ نہ طرز کہن کہیں جس کو سخن ہوا ایسا کہ معیار فن کہیں جس کو

محسنؔ چونکہ ایک مذہبی گھرانے کے پروردہ ہیں اس لئے اپنے مرثیوں سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ نصف صدی قبل ہندوستان میں لادینی اور خصوصاً مسلمانوں میں دین سے بیزاری پر وہ بہت دکھی ہیں:

جس طرف دیکھئے آتے ہیں نظر تارک دیں
جہلا خوش ہیں نہایت علما ہیں غمگیں
ہیں تفکر میں بہت مالک املاک وزمیں
ہے رذیلوں کا زمانہ شرفا خانہ نشیں
لوٹ ہر سمت ہے محفوظ کوئی جیب نہیں
غیر کا مال بھی لے لینے میں اب عیب نہیں

محسنؔ کو اس بات کا بہت صدمہ ہے کہ مرد تو مرد عورتوں نے بھی مذہب سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر جگہ موجود ہیں۔ انہوں نے بڑے کرب کے ساتھ کہا ہے کہ اب مردوں کی حیا و شرم بھی ختم ہو گئی ہے اور وہ اپنی عورتوں کو بے پردہ رکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

بے حجابی کا چلن عورتوں کا جلسوں میں شور
گئی مردوں کی حیا دیدۂ دل ہو گئے کور
زور کثرت کا زمانے میں ہے قلت کمزور
ظلم کی آئی ہیں ہر سمت گھٹائیں گھنگھور
گھر جسے کہتے ہیں ہم اب وہ قفس اپنا ہے
انتہا ہے کہ زباں پر نہیں بس اپنا ہے

انہوں نے اس کا بھی اشارہ کیا ہے کہ عورتوں کو گمان ہے کہ پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ حالانکہ یہ تصور ہی ناقص اور غیر منطقی ہے:

اس لئے عورتوں نے پردے کا چھوڑا دستور
بے حجابی سے بڑھائیں خرد و عقل و شعور
ناقص العقل زمانے میں ہوں عاقل مشہور
پیش زن مرد ہیں اب معترف عجز و قصور
وہی عورت ہے پسندیدہ کہ جو سیر کرے
نسلیں غارت ہوئی جاتی ہیں خدا خیر کرے

دوسری جنگ عظیم جس نے لاکھوں افراد کو موت کی نیند سلا دیا، ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے، امریکہ کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی تجربہ نے محسن کے ذہن و دماغ کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ اس ذہنی کشمکش کا اشارہ اپنے ایک مرثیے میں کرتے ہیں:

جتنے دنیا میں ممالک ہیں وہ بے خوف نہیں
خبریں دیتے ہیں یہ اخبار ہے پھر جنگ قریں
آئٹم بم کی ہوا کرتی ہیں ایجادیں کہیں
چین والے تو ہیں اک دوسرے پر چیں بہ جبیں

کوئی آئین و قوانین نہ شاہی کے ہیں
جس طرف دیکھئے آثار تباہی کے ہیں
نہیں باقی ہے جواب ہمت جنگ شمشیر
جانیں لینے کی نکالی ہے نرالی تدبیر
اڑتی رہتی ہیں جہاز ان ہوائی کی بہیر
شہروں پر پھینکتے ہیں مادۂ آتشگیر
قومیں کمزور و پریشان ہوئی جاتی ہیں
بستیاں ملکوں میں ویران ہوئی جاتی ہیں

ان حالات سے پریشان ہو کر محسن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب دنیا میں کہیں بھی جائے امن نہیں، ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول ہے اور انسان ناامیدی کا شکار ہو گیا ہے:

مفلسی سستی ہے ہر شئ ہے گراں عالم میں
عافیت کا نہیں ہے نام و نشاں عالم میں
گھر بھی اپنا نہیں اب جائے اماں عالم میں
نظر آتا ہے قیامت کا سماں عالم میں
گھیرے ہر سمت سے ہے خوف و ہراس انساں کو
جان سے مال سے اب ہو گئی یاس انساں کو

اور اس ماحول میں جس میں کسی کو کسی کی فکر نہیں۔ ادب، مذہب ہر جگہ ابتری ہے یہانتک کہ انسان کو انسان کا بھی خیال نہیں ہے:

حاصل انسان کو انسان کی تائید نہیں
ملے آپس میں گلے کون کہ جب عید نہیں
بزم عالم میں ادب کی کوئی تجدید نہیں
نظم اردو میں کہی جائے یہ امید نہیں

Scanned with CamScanner

دین و دنیا کا یہاں حال بہت ابتر ہے
دفترِ مذہب اسلام بہت ابتر ہے

ان حالات کو دیکھ کر محسنؔ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ فانی دنیا جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چنانچہ وہ عمل خیر کی تلقین کرتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، دنیا کی حقیقت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ شاعر کا حسن نظم بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

باغ دنیا ہے گذرگاہ صبا کہتی ہے
جا ٹھہرنے کی نہیں ہے یہ ہوا کہتی ہے
حسن دو دن ہے ہر اک گل کی ادا کہتی ہے
ہے سدا کب یہ عنادل کی صدا کہتی ہے
چشم نرگس کی ہے تقدیر میں حیراں ہونا
زلف و سنبل کی ہے قسمت میں پریشاں ہونا

سفر عالم باقی کا نہیں دور ہے دن
زاد راہ اپنی مہیا کرو تم بھی محسنؔ
عمر طبعی سے زیادہ ہے تمہارا اب سن
عمل نیک کرو جتنے ہوں تم سے ممکن
وہی مومن ہے جو آپس میں محبت سے رہے
صاف آئینۂ دل، گرد کدورت سے رہے

چھوڑو اس سن میں خدا کے لئے دنیاداری
اپنی تم منزل مقصد کی کرو تیاری
شامل حال بہر طور ہے فضل باری
ہوگی محسوس نہ اس راہ میں کچھ دشواری

دل چلے شوق سے اپنا روش ایماں پر
نظریں اپنی رہیں نقش قدم سلماں پر

سراپا مرثیے کا ایک اہم جزو ہے۔ اردو مرثیہ نگاروں نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ محسنؔ نے بھی اس پر طبع آزمائی کی۔ ان کی زبانی امام حسینؑ کا سراپا ملاحظہ کریں:

صدقے ہیں شمس و قمر ایسی منور ہے جبیں
دونوں ناقص ہیں نہیں اس لئے آتے ہیں قریں
رن میں پھیلا ہے جو نور رخ شاہنشہِ دیں
آسماں کو یہ ہوس ہے کہ بنے آج زمیں
طلعت ابروئے خمدار نظر آتی ہے
رن میں کیا نور کی تلوار نظر آتی ہے

صاف ہے رشک دہ چشمۂ کوثر آنکھیں
جن کے نظارے سے ہوتی ہیں منور آنکھیں
بخشش امت عاصی کے لیے تر آنکھیں
چشم بد دور لٹاتی ہوئی گوہر آنکھیں
یہ وہ گوہر ہیں خریدار ہے رحمت جن کی
یہ وہ گوہر ہیں کہ قیمت ہے شفاعت جن کی

مرثیے کا ایک جزو رخصت ہوتا ہے۔ امام حسینؑ کی رخصت کا منظر محسنؔ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بیت اور اس کے بعد کے بند ملاحظہ فرمائیں جس میں غم و الم کی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے بھی محسنؔ نے اخلاقیات کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ منظر نامہ ہے امام حسینؑ اہلِ حرم سے رخصت ہو رہے ہیں اور ہر ایک کو سلام آخر کر رہے ہیں:

پئے رخصت جو شہ بیکس و تنہا اٹھا
شک یہ لوگوں کو ہوا کوئی جنازہ اٹھا

Scanned with CamScanner

اس کے بعد امامؑ مظلوم درخیمہ پر آتے ہیں اور ایک ایک کو سلام کرتے ہیں:

کہا کہ زینبؑ و کلثوم کو سلام مرا
حسنؑ کی بیوۂ مغموم کو سلام مرا
مری سکینۂ معصوم کو سلام مرا
رباب و بانوئے مظلوم کو سلام مرا
سلام آخری کبریٰ پہ اُمِ لیلیٰ پر
سلام آخری فضہ کنیز زہراؑ پر

سلام ان پر جنہوں نے فدا کئے شوہر
سلام ان پہ ہوئے ہیں شہید جن کے پسر
سلام ان پہ کہ جن کے تباہ ہو گئے گھر
سلام ان پہ جو ہیں مبتلائے خوف وخطر
سلام بچوں پہ جن کے جگر دو نیم ہوئے
سلام میرا صغیروں پہ جو یتیم ہوئے

اہل حرم سے رخصت اور ان پر سلام آخر کے بعد امام حسینؑ میدان میں تشریف لائے اور لشکر اعدا سے یوں خطاب کرتے ہیں:

قریب فوج مخالف جو پہنچے شاہ انام
کیے بہ لطف یہ اعدائے دیں سے شہ نے کلام
کہ اے سپاہ رے وروم ومصر وکوفہ وشام
میں تم سے آخری حجت یہ کر رہا ہوں تمام
پسر علیؑ کا پیمبرؐ کا نور عین ہوں میں
جو حق شناس ہوں پہچان لیں حسینؑ ہوں میں

مرثیے کا ایک جزو جنگ ہے۔ اسی جزو نے اردو شاعری کو رزمیہ شاعری سے مالا مال

کیا ہے۔ جنگ کا اہم عنصر تلوار ہے۔ محسنؔ کی باریک بین نگاہ سے تلوار کا وصف ملاحظہ فرمائیں:

آپ کی سیف کی تعریف میں قاصر ہے زباں
دم ضربت ہے جسے دوری وقربت یکساں
بڑھ وہ جس سے کسی جا نہیں دشمن کو اماں
گھاٹ وہ گھاٹ جو ہو جائے نگاہوں سے نہاں
پانی ایسا کہ جو بہتا رہے دریا کی طرح
نور ایسا کہ جو سمٹے ید بیضا کی طرح

مرثیے میں جنگ ہی کے ضمن میں شعرا نے گھوڑے کی تعریف بڑی خوبصورتی سے کی ہے محسنؔ کا رنگ بھی قابل دید ہے:

کتب میں گھوڑے کے بارے میں ہے یہی ارقام
وہ ذوالجناح تھا اسپ پیمبرؐ اسلام
رقم ہے یہ بھی وہ تھا دلدل رسولؐ انام
ہے ایک یہ بھی روایت کہ مرتجز تھا نام
تھا کس لقب سے ملقب یہ بات صاف نہیں
نبیؐ کا تھا وہ فرس اس میں اختلاف نہیں

تھا ایک خاص یہ اعجاز احمدؐ مختار
ہوئے وہ گر کسی مرکب پہ ایک بار سوار
مسن بھی ہو کے نہ بیکار وہ ہوا زنہار
جواں رہا وہ سوار براق کا رہوار
حضور کی جو سواری سے فیضیاب رہا
نہ مرتے مرتے جدا اس سے پھر شباب رہا

یوں تو مرثیوں میں ساقی نامہ میر ضمیر کے عہد ہی سے داخل ہو گیا تھا اور دبیر کے شاگردمیاں

Scanned with CamScanner

مشیر اور رحمی بلگرامی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ لیکن پیارے صاحب رشید نے ساقی نامہ کو فنی حیثیت دی جس کے بعد ساقی نامہ نے ایک روایتی شکل اختیار کر لی جس کا التزام محسن نے بھی رکھا:

مدح ساقی ہے وظیفہ سحر و شام مرا
مشغلہ اک یہی میرا ہے یہی کام مرا
یہی پیمانہ ہے میرا تو یہی جام مرا
یہی آغاز ہے میرا یہی انجام مرا
عمر بھر ذوق رہا اس کا گوارا مجھ کو
جو بھی عالم ہوا اسی کا ہے سہارا مجھ کو

ساقیا میں بھی تو ہوں اک ترے میخواروں میں
بن یعقوبؑ کے مانند خریداروں میں
صفت موسیٰ عمراں ہوں طلبگاروں میں
مثل عیسیٰؑ کے ہوں میں بھی ترے بیماروں میں
جی اٹھوں تیری محبت میں اگر مر جاؤں
یہی پیتا ہوا مے تا لب کوثر جاؤں

مرثیے کے اجزا میں شہادت اور بین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ محسن کا قلم اس میدان میں بھی کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے:

جلتی ریتی پہ جو پہنچا تن مجروح حسینؑ
تپشِ خاک سے حضرت کا ہوا دل بے چین
ہوا مجبور جگر بند رسولؐ الثقلین
اٹھ کے بیٹھا پسر فاتح صفین و حنین
پر نہ آرام ذرا قلب کو پاتے دیکھا
شمر کو سامنے خنجر بکف آتے دیکھا

مرثیے کا درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں اور شاعر کے کمال اور حسن عقیدت کی داد دیں:

تری طرح نہ ہوا کوئی دردمند حسینؑ
ذبیح سے بھی ہے بالا ہزار چند حسینؑ
وہ عضو عضو جدا قطع بند بند حسینؑ
رہا نہ سر تو ہوا اور سربلند حسین
قدم سے تیرے شکست اور کفر و شر کو ہوئی
طویل نیزے پہ معراج تیرے سر کو ہوئی

اور بین کا یہ بند بھی قابل دید ہے:

نکلی تھی خیمہ سے زینبؑ جو بصد آہ و فغاں
دیکھا ہمشیر نے سب ذبح برادر کا سماں
سر کو معراج ملی کٹتے ہی بالائے سناں
تن صد چاک سے لپٹی رہی وہ نوحہ کناں
بین سے لاشِ شہ عرش نشیں ہلتی تھی
عرش سے خون برستا تھا زمیں ہلتی تھی

محسن نے ۳۰ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء کو اپنے وطن زید پور میں انتقال کیا اس طرح زید پور کی بزم مرثیہ گوئی کی آخری شمع گل ہو گئی۔ سید محمد رضا عابد نے تاریخ کہی مادہ درج ذیل ہے:

مقطع نظم الم مظہر تاریخ بھی ہے
بایقیں فخر زمن آہ محمد محسن
۱۴۰۶ھ

Scanned with CamScanner

محمد باقر، باقرؔ جوراسی

فراستؔ زید پوری کے ہونہار شاگرد، مشہور عالم دین، مترجم اور صحافی جنہوں نے نہ صرف شاعری کے ذریعہ مذہب اہل بیت کی تبلیغ کی بلکہ ایک ایسی نسل کی بھی تربیت کی جس نے قلم وقرطاس کے ذریعہ اسلام کا دفاع کیا۔ مولانا محمد باقرؔ جوراسی ایک دردمند اور حساس دل رکھنے والے عالم دین تھے۔ ماہنامہ 'اصلاح' کھجوا اور 'ادارۂ اصلاح' کو انہوں نے اس وقت زندگی دی جب یہ ادارہ مولانا محمد باقر ابن مولانا سید علی حیدر کے انتقال کے بعد جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ مولانا باقرؔ جوراسی کو اس کا بیحد قلق تھا کہ ان کے دوست کے انتقال کے بعد یہ ادارہ دم توڑ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس ادارے کو از سر نو زندگی دینے کی ٹھان لی۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے لائق وفائق فرزند خطیب اہل بیت مولانا جابر جوراسی کو اس کی ادارت کے لئے آمادہ کیا جنہیں ماہنامہ الواعظ لکھنؤ کی ادارت کا تجربہ تھا۔ اور بحمداللہ آج بھی 'اصلاح' لکھنؤ سے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

مولانا باقرؔ جوراسی نے نثر کے ساتھ ساتھ نظم کے بھی گیسو سنوارے ہیں۔ انہوں نے لاتعداد غزلیں، قصیدے، سلام، رباعی، نوحے، مناجاتیں اور تاریخیں کہی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے استاد فراستؔ زید پوری کے رنگ میں چار مرثیے بھی کہے ہیں۔

بیسویں صدی میں مرزا اوج مرحوم کی تحریک پر مرثیوں میں خاص تبدیلی یہ آئی کہ ان کے الگ الگ عنوانات رکھے جانے لگے۔ اور عنوانات کے تحت مرثیوں کا چہرہ کسی

مخصوص موضوع پر ہوتا تھا۔ اور اسی موضوع کو کربلا کے واقعات اور کرداروں سے ربط دے کر بنیہ عنصر کو نظم کر دیا جاتا تھا اور زیادہ زور چہرے کے فلسفیانہ مضامین پر ہوتا تھا۔ اگرچہ بہت سے مرثیہ گویوں نے اس دور میں بھی کلاسیکی انداز کے اچھے مرثیے کہے ہیں۔ لیکن جدید مرثیے کی پہچان ان کے یہی موضوعاتی چہرے ہی بنے۔

مولانا باقرؔ جوراسی فراست زید پوری کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے استاد کی تقلید میں تاریخ اسلام کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ امام حسین کے ان انصار کو اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے۔ جنہیں عام مرثیہ نگاروں نے اپنے مرثیوں میں جگہ نہیں دی۔ لیکن مولانا باقرؔ جوراسی نے اپنے مرثیوں میں تھوڑا الگ انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے ان مرثیوں کے چہرے میں فلسفے کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا بھی کام لیا ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ پورے کے پورے مرثیے میں موضوع سے انحراف نہیں کیا ہے۔ 'فلسفۂ یادگار' اور 'فلسفۂ ہدایت' ان کے اسی قبیل کے مرثیے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے مرثیہ نگاروں کے محبوب موضوعات کو نہیں اپنایا ہے لیکن ان مرثیوں میں بھی جدت اختیار کی ہے۔ جیسے حضرت حبیب ابن مظاہر کے مرثیے کا عنوان 'معراج محبت' رکھا ہے۔ اس مرثیے میں مولانا باقرؔ نے محبت، عشق اور اس کی کشش کے مختلف پہلوؤں اور کیفیتوں کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے:

اے خانۂ دل شمع محبت سے چمک جا
اے دامن دل عشق کے پھولوں سے مہک جا
اے ساغر دل بادۂ الفت سے چھلک جا
اے کوزۂ دل کر لے تو اس بحر کو یک جا
وہ انس جو ہے انس میں احسان کی خاطر
سرمایۂ تہذیب ہے انسان کی خاطر
یہ رشتہ ہے شیرازۂ تنظیم دو عالم
ہونے نہیں دیتا ہے جو تہذیب کو برہم

Scanned with CamScanner

خلقت میں ہر اک چیز کی یہ چیز ہے مدغم
ہر ذرہ مجہول میں اک ربط ہے محکم
جذبہ یہ اگر جذب کا اجزا میں نہ ہوتا
موجود مجسم کوئی دنیا میں نہ ہوتا

پیشانی گردوں پہ ضیا بار ستارے
چشم و مہ و خورشید کے دن رات نظارے
افلاک کے پھیلے ہوئے اوراق یہ سارے
وہ صفحۂ اول کے شفق زار نظارے
قائم اسی بنیاد پہ ان سب کی بنا ہے
ہر پیکر صنعت میں یہی روح بقا ہے

اک فرش زمرد پہ وہ سیاروں کا چلنا
اور اپنے منازل سے ثوابت کا نہ ٹلنا
منہ چاند کا پردے سے نہاں ہو کے نکلنا
رخ اپنے طریقے سے کسی کا نہ بدلنا
معیار یہ ہر ایک کا عنوان کشش ہے
سرگرم عمل طاقت موزون کشش ہے

اس کے بعد عشق رسولؐ اور عشاق کی وفاداری کا ذکر کرتے ہوئے مرثیے کے چہرے کو واقعات کربلا سے مربوط کیا ہے:

تکمیل وفا کے کوئی ڈھونڈے جو مناظر
دیکھے سوئے اصحاب شہ صابر و شاکر
نازاں تھی ضعیفی وہ ملے آپ کو ناصر
وہ مسلم کوفی وہ حبیب ابن مظاہر

فردوس محبت کا جو ماحول رہا تھا
رگ رگ میں جوانی کا لہو کھول رہا تھا

مولانا باقر جوراسی نے اپنے مرثیہ 'فلسفۂ یادگار' میں یہ بتایا ہے کہ دنیا کی ہر قوم اپنی یادگار کو باقی رکھتی ہے اور جس قوم کا ماضی تابناک اور زریں ہوتا ہے وہ قومیں اپنی یادگار مناتی ہیں:

دراصل راز حسن عمل یادگار ہے
تقلید کے معمے کا حل یادگار ہے
ہر امر پر اثر کا بدل یادگار ہے
اک سنت قدیر ازل یادگار ہے
ملتا بغیر اس کے نہ اخلاق کا سبق
ہوتی کہاں زمانے میں تاریخ ماسبق

انہوں نے اپنے مرثیہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ نماز، روزہ، حج اور کلام خدا قرآن یہ تمام چیزیں یادگار ہیں۔ اور یادگار منانا چونکہ فطرت کا تقاضا ہے اسی لئے امام حسین کی شہادت کی یادگار منائی جاتی ہے:

تنہا نہیں شہید ستم ہی پہ انحصار
بحر رضائے حق جو کرے نقد جاں نثار
اس دولت دوام کا ہے وہ بھی حصہ دار
یعنی خدا بھی اس کی مناتا ہے یادگار
یہ کام جو ہے معنیٔ طاعت کا آئینہ
تصویر دل میں رکھتا ہے فطرت کا آئینہ

اسی طرح 'فلسفۂ ہدایت' میں انہوں نے بتایا ہے کہ ہدایت کا نظام عالم گیر ہے۔ حیوانات و نباتات تک نظام ہدایت کے پابند ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی رہنما کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی لئے انسان کو بدرجۂ اتم کسی ہادی کی ضرورت ہوتی ہے:

Scanned with CamScanner

نوعِ انساں کی ہدایت تو ہے ان سب سے اہم
کیوں کہ اس قوم کے ماتحت ہے سارا عالم
انبیاء کتنے ہی آدمؑ سے ہوئے تا خاتم
جو بناتے رہے انسانوں کو انساں پیہم
جب یہی اشرف المخلوق کے حاکم ٹھہرے
تب تو مخدوم ہے، پیرو جو ہیں خادم ٹھہرے

جب تمام اپنے فریضہ کو نبوت نے کیا
ختم یہ سلسلۂ پاک مشیّت نے کیا
پیش جو کچھ بھی زمانے میں شریعت نے کیا
انتظام اس کی حفاظت کا امامت نے کیا
اس کو رکھے گا خدا تا بہ قیامت قائم
ہو سکے تا کہ ہر اک فرد پہ حجت قائم

ذکرِ نبوت و امامت کے ذیل میں اخلاقِ رسولؐ کا ذکر کرتے ہوئے امام حسینؑ سے ربط دینے کا انداز بھی بڑا حسین ہے:

حسن اخلاق کے ہیں چار مسلم جو اصول
جن سے ہوتا ہے ہر اک فرع سعادت کا حصول
پیش کرتا رہا ان سب کو جگر بند بتول
تا کہ مدغم نہ جہالت میں ہو تعلیم رسولؐ
کچھ نہ سمجھے وہ مگر مقصد تدبیر نبیؐ
جن کے ہاتھوں سے مٹی دشت میں تصویر نبیؐ

استاذی پروفیسر نیر مسعود نے ان کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''واقعاتِ کربلا کے بیان میں شاعر کے اصلی جوہر نکلتے

ہیں۔ مولانا مرحوم جید عالم تھے۔ اس لئے علمیت کی شان یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کربلا سے متعلق واقعات کو وہ بہت شاعرانہ اور پر اثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ ان واقعات کا ذکر آتے ہی ان کا قلم اشک آلود ہو جاتا ہے۔ مرثیے میں ایک غم کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس میں بکا کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے 'مآل مجلس' کہتے ہیں اور جو جدید مرثیے میں کم سے کمتر ہوتی جا رہی ہے۔'' ۶۵

مرثیہ 'شامِ غریباں' خالص بیانیہ مرثیہ ہے۔ اس میں چہرہ وغیرہ نہیں ہے اور مرثیہ براہِ راست دسویں محرم کی بلا خیز شام کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ اس مرثیے میں مولانا نے شامِ غریباں سے متعلق ان روایتوں کا ذکر کیا ہے، جسے عام طور پر مقاتل نے ذکر کیا ہے۔ مولانا اپنی مصروفیات کے سبب مرثیہ نگاری پر زیادہ توجہ نہ دے سکے لیکن مراثی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے بھی شہ سوار تھے۔

Scanned with CamScanner

معصومہ خاتون، خاتونؔ

معصومہ خاتون نے بہت نوحے کہے ہیں ان کے نوحوں کی امتیازی خصوصیت رثائیت اور فنی پختگی ہے جو انہیں اس عہد کی دیگر نوحہ گو خواتین سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کے نوحوں کا ایک انتخاب کراچی (پاکستان) سے ان کے صاحبزادے سید صفدر مہدی نے شائع کر دیا ہے۔ ان کا ایک مرثیہ جناب معصومہ قم کے حال پر مشتمل (۵۴ بند)۔ ع

بیکس جہان میں نہ کسی کو خدا کرے

راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔ جسے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ خاتونؔ زید پوری کے نوحے کافی مقبول ہیں۔ ان کا ایک فریادی نوحہ ہے جس میں سید الشہدا امام حسینؑ کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ نوحہ تقسیم ملک کے زمانہ کے ہنگاموں کے تعلق سے کہا گیا ہے:

وقت ہے امداد کا ہند میں آ و حسینؑ
بگڑے ہیں ہم سب کے کام آ کے بناؤ حسینؑ
بن گئی ہے جانوں پر لیجئے مولا خبر
فاتح خیبر کا زور آ کے دکھاؤ حسینؑ
جل گئے ہیں کتنے شہر، ہے یہ زمانے میں قہر
امن کی صورت کوئی ہم کو دکھاؤ حسینؑ

اسی طرح خاتونؔ نے امام ہشتم کا جو نوحہ کہا وہ انفرادی حیثیت کا حامل ہے:

کہتی ہیں یہ ہم شیر رضا، ہائے برادر
تم ہوتے ہو اب ہم سے جدا، ہائے برادر
ہمراہ تھے سب اہل حرم سبط نبیؐ کے
حضرت کا تو سب کنبہ چھٹا، ہائے برادر
خاتونؔ بچھڑ کر نہ ملی بھائی سے ہم شیر
کہتی تھی بصد درد و بکا، ہائے برادر

خاتونؔ نے جہاں امام غریب الغربا کا نوحہ کہا وہیں جناب فاطمہ کبریٰ کا بھی نوحہ کہا:

ہر صبح کو منھ ڈھانپتی تھیں یاد پدر میں
سب کنبہ کی تھیں سوگ نشین فاطمہ کبریٰ

خاتونؔ نے تاثراتی نوحے بھی کہے ہیں۔ جب آل سعود نے جنت البقیع میں روضوں کو مسمار کر دیا تو خاتونؔ نے اپنے تاثرات کو نوحوں کے قالب میں ڈھال دیا:

سنتے ہیں مٹی قبر ابو طالب سردار
حمزہؓ کی لحد کا بھی نشاں ختم ہوا ہے
مسمار قبر فاطمہؑ صغریٰ ہوئی ہے آج
کر ظلم کر گئے ستم ایجاد، یا علیؑ
قدسی جھکے جس در پر ان روضوں کی یہ حرمت
مٹ جائے نشاں بالکل ان قبر منور کا

خاتونؔ فراستؔ اور یونسؔ کی تربیت یافتہ تھیں اس لیے ان کے نوحے اور مرثیے جدت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ زید پور میں معصومہ قم کا تابوت بھی اٹھایا جاتا ہے اور ان کی شہادت کے دن کو یوم غم کے طور پر منایا جاتا ہے۔ خاتونؔ نے معصومہ قم کا مرثیہ بھی کہا اور نوحہ بھی:

Scanned with CamScanner

مولا کی سوگوار سدھاری جہان سے
سنسان اہل دیں کا عزا خانہ ہو گیا

سطور بالا میں خاتونؔ زید پوری کے بارے میں سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔لیکن ان کا معصومۂ قم کے سلسلے کا مرثیہ یادگار اہمیت کا حامل ہے۔اس لئے آئندہ صفحات میں غیر مطبوعہ مرثیہ بغیر کسی تمہید وتبصرے کے، سید محمد رضا عابد سابق جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا مقیم حال مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔(عابد حیدری)

مرثیہ

(حضرتِ معصومۂ قم)

بیکس جہان میں نہ کسی کو خدا کرے
دردِ فراق میں نہ فلک مبتلا کرے
ہمشیر کو نہ بھائی سے قسمت جدا کرے
عاشق بہن جو جان کو ہر دم فدا کرے
بچھڑے جب ایسے بھائی سے کسطرح چین ہو
ہر صبح و شام رونا نہ کیوں فرضِ عین ہو

آل نبیؐ پہ رنج و الم کیا گذر گئے
افسانہ غم ہے بھائی بہن کے یہ حادثے
چھٹ کر بہن سے پھر نہ امام رضا ملے
کچھ دن تو فاطمہؑ نے تڑپ کر بسر کئے
دل زندگی سے سیر تھا درد و جدائی سے
ہر دم یہی دعا تھی ملوں اپنے بھائی سے

قبر نبی پہ روتی تھی جاجا کے صبح و شام
قرآں کبھی پڑھا تو درود اور کبھی سلام
پڑھتی تھیں جب زیارت پیغمبر انام
سینہ میں دل تڑپتا تھا یاد آتے تھے امام
فارغ کہ جب طواف زیارت سے ہوتی تھیں
بھائی کی خیریت کی دعا کرکے روتی تھیں

روضہ سے جد کے شام کو آتی تھیں اپنے گھر
ہوتی تھی رات طاعتِ خالق میں سب بسر
چہرے پہ زردی چھا گئی تھا ضعف اسقدر
سنساں مکاں میں اٹھ گئی جس سمت کو نظر
بے چین ہو گئیں نہ کوئی بات بھاتی تھی
خالی جگہ وہ بھائی کی دیکھی نہ جاتی تھی

رونے تڑپنے میں یوں ہی مدت گذر گئی
قاصد نہ آیا کوئی نہ کچھ بھی خبر ملی
مہر سکوت لب پہ مگر دل میں بے کلی
دل میں یہی خیال کہ کب آئیں گے اخی
زینبؑ کو جس طرح تھی محبت حسینؑ سے
تھا فاطمہؑ کو عشق شہِ مشرقین سے

اک دن ندا کسی نے دی ڈیوڑھی پہ آن کے
میں قاصد رضاؑ ہوں یہ خط لایا طوس سے
بھیجا کنیز کو اسے لینے کے واسطے
آنکھوں سے بس لگا کے پڑھا خط کو کھول کے
حمد خدا کے بعد لکھا اشتیاق ہے
بھائی کو ناگوار تمہارا فراق ہے

Scanned with CamScanner

جلد آؤ اے بہن کہ مجھے انتظار ہے
کیا ہم لکھیں یہاں کا جو کچھ حالِ زار ہے
دنیا ہے بے ثبات نہیں اعتبار ہے
اور آگے جو کہ مصلحتِ کردگار ہے
ظاہر میں کچھ تو اور ہے باطن میں اور ہے
ایذائیں پہونچی ہم کو یہی فکر و غور ہے
مجبور ہوں بہن تمہیں لے جاتا آن کر
بے چین گھر میں تم ہو مرے دل کو ہے خبر
ہے مصلحت یہی کہ چلی آؤ تم اِدھر
دل چاہتا ہے دیکھ لیں ہم تم کو اک نظر
تعجیل آنے میں کرو عرصہ نہ ہونے پائے
ایسا نہ ہو کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے
مضمون پڑھ کے اشکوں کا دریا بہا دیا
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولیں غضب ہوا
تحریر میں جو کہ قبلۂ حاجات نے لکھا
بھائی کو ہے مرے کسی آفت کا سامنا
ناقدر سب ہیں چاہنے والا کوئی نہیں
تنہا ہیں ملکِ غیر میں اپنا کوئی نہیں
تھا اضطراب ایسا کہ پھر نہ سنبھل سکی
آنے لگا جو غش تو گریں کہہ کے یا علیؑ
تکیہ پہ سر تھا اور تھی گردن ڈھلی ہوئی
کچھ دیر تک غشی رہی پھر آنکھ کھل گئی
اٹھیں بہ اضطراب جگر کو سنبھال کے
حجرے سے لا کے رکھ دیا بستر نکال کے

فرمایا یہ کنیز سے ساماں درست کر
باہر یہ کہہ عماری کسی جائے ناقہ پر
ڈیوڑھی کے سامنے ہو قناتیں اِدھر اُدھر
ہمسائیوں کو کر دے مرے جانے کی خبر
کہنا کہ دردِ ہجر سے ناچار ہو گئی
عزمِ سفر کو آج ہی تیار ہو گئی
سنتے ہی اس خبر کو بس اک تہلکہ ہوا
روتی ہوئی نکل پڑیں سب اوڑھ کر ردا
عورات ہاشمی و قریشی سب ایک جا
ہو کر بہم چلیں طرفِ خانۂ رضاؑ
شہزادی کے قدم پہ سروں کو جھکاتی تھیں
معصومہ قم ہر اک کو گلے سے لگاتی تھیں
ہونے لگیں سوار تو رونے کا غُل اٹھا
ہمسائیاں یہ کہتی تھیں آنسو بہا بہا
بی بی کو خیریت سے یہاں لائے پھر خدا
ہم سب کی آس ٹوٹ گئی وا مصیبتاہ
طے منزلیں ہوں چین سے جانا نصیب ہو
بی بی کو پیارے بھائی سے ملنا نصیب ہو
لکھا ہے فاطمہؑ تو ادھر ہوتی تھیں سوار
حضرت کی اک پھوپھی تھیں علیل و نحیف و زار
تھیں وہ جدا مکاں میں خبر تھی نہ زینہار
آواز گونجی کانوں میں رونے کی ایک بار
پوچھا رضاؑ کے گھر میں یہ کیوں شور و شین ہے
بتلاؤ مجھ کو لوگو نہیں دل کو چین ہے

Scanned with CamScanner

سب نے کہا کہ جاتی ہے خواہر امام کی
فرمایا لے چلو مجھے میں دیکھ آؤں گی
بولی کنیز دیکھ کے آئی ہوں میں ابھی
شہزادی کی سواری ہے در پر لگی ہوئی
تم پیر و ناتوان ہو چلنا محال ہے
بولیں بغیر دیکھے مرا غیر حال ہے
موزے پہن کے ڈال لی بس بی بی نے نقاب
مشکل سے پہنچی بیٹھتی اٹھتی بہ اضطراب
معلوم فاطمہؑ کو ہوا آتی ہیں جناب
فوراً سواری روک کے اتریں نہ آئی تاب
شفقت سے پھر پھوپھی نے گلے سے لگا لیا
اس طرح دونوں روئیں کہ سب کو رلا دیا
پوچھا پھوپھی نے جاتی ہو نورِ نظر کہاں
فرمایا قصد طوس کا رکھتی ہوں اماں جاں
بولیں سدھارو خالقِ اکبر نگاہباں
جیتی تھی تم کو دیکھ کے یہ زار و ناتواں
بالیں یہ ہوں گے سب تمہیں ڈھونڈونگی فاطمہؑ
کہتی تھیں آہ تم کو نہ پاؤں گی فاطمہؑ
دے کر تسلی سب کو سدھاریں بدرد و یاس
پردہ تھا پر جھکی ہوئی آئی تھیں در کے پاس
آگے بڑھی سواری پھریں بیبیاں اُداس
ہمراہ اپنے رکھ لیا بستر اور اک لباس
کوئی عزیز ساتھ نہ کچھ اہتمام تھا
ہمراہ اک کنیز تھی اور اک غلام تھا

پہنچی سواری جب درِ مسجد کے سامنے
محمل سے بس اُتر پڑیں تعظیم کے لیے
داخل ہوئیں حرم میں زیارت کے واسطے
روئیں لپٹ لپٹ کے مزار رسولؐ سے
مُڑ مُڑ کے چار سمت بہ حسرت نگاہ کی
زیارت پڑھی وداع کی اک سرد آہ کی
پھر جنت البقیع میں آئیں بہ چشمِ تر
تھیں جا بجا بزرگوں کی قبریں اِدھر اُدھر
ہر ایک پر سلام پڑھا ہو کے نوحہ گر
تا دیر روئیں بیٹھ کے دادا کی قبر پر
کہتی تھیں آہ بھر کے مرے دل پہ داغ ہے
افسوس ہے کہ اب یہ حرم بے چراغ ہے
رخصت ہوئیں حرم سے بہ درد و محن چلیں
افسوس ہے مجاور شاہِ زمن چلیں
ملنے کو پیارے بھائی سے عاشق بہن چلیں
زینبؑ کی طرح چھوڑ کے اپنا وطن چلیں
چرچا جہاں میں دونوں کی الفت کا رہ گیا
افسانہ ایک دونوں کی غربت کا رہ گیا
درگاہ حق میں راہ میں کرتی تھیں یہ دعا
کر رحم میرے حال پہ اے میرے کبریا
اے دادرس غریبوں کے سن میری التجا
پہنچا دے مجھ کو طوس پیمبر کا واسطہ
جانے میں دیر ہوتی ہے غم کھاتی ہے کنیز
کٹتی نہیں ہے راہ تو گھبراتی ہے کنیز

Scanned with CamScanner

منزل پہ منزل آپ کہیں دم نہ لیتی تھیں
لکھا ہے پہنچیں منزلِ ساوا کے جب قریں
ازحد جو ناتواں تھیں تو بیمار ہو گئیں
سمجھیں کہ طوس تک میں پہنچ سکتی ہی نہیں
پوچھا یہ راہگیروں سے قم کتنی دور ہے
پہنچوں گی کب تلک مجھے جانا ضرور ہے
دس فرسخ اس جگہ سے ہے قم سب نے یہ کہا
اندازہ یہ ہے ہوئیگا کچھ اس سے بھی سوا
کچھ دور جا کے واں سے ارادہ بدل دیا
موڑی سواری اور اسی جانب کا رُخ کیا
دن کو کہیں چلیں تو کہیں شام ہو گئی
نزدیک پہنچیں قم تو خبر عام ہو گئی
سرحد پہ قم کے پہنچی سواری جو ناگہاں
سب نے سنا کہ آتی ہیں شہزادیٔ جہاں
نکلے گھروں سے دوڑ کے سب خورد اور کلاں
تھا ہاتھ میں علم لیے اک ہاشمی جواں
لینے کو آئے دور سے اپنی خوزادی کو
سب ساکنانِ شہر چلے پیشوائی کو
تھے انتظار میں وہ غلامِ شہِ نجف
ناقہ جو آیا سامنے مثلِ دُرِ صدف
صلوٰت کے وہ نعرے وہ تکبیر ہر طرف
مجرے کو ایک بار جھکے سب وہ صف بہ صف
جو ہے رئیسِ شہر وہ تھامے مہار تھا
کیا شان ہے سواری کی کیا اقتدار تھا

آگے تو اس سواری کے ہے سامنے علم
چلتے ہیں گرد و پیش جلودار سب بہم
تسبیح اربعہ تھی زبانوں پہ دم بہ دم
سرخم کیے ادب سے بڑھاتے ہیں سب قدم
دل پر ہجومِ غم ہے تو چہرے اداس ہیں
انداز ماتمی ہے کہ کالے لباس ہیں
پہنچی سواری آپ کی اس آن بان سے
لائے امام زادی کو کس عزو شان سے
بہتر مکاں نہ شہر میں تھا جس مکان سے
خالی کرایا آپ کے پردے کے دھیان سے
ڈیوڑھی کی سمت ناقہ کو بٹھلایا پھیر کے
ہمراہی دور ہٹ گئے پردے کو گھیر کے
جو آس پاس لوگ تھے ان کو ہٹا دیا
اور کل مکاں میں فرشِ مصفا بچھا دیا
مسند کو ایک حجرے کے اندر لگا دیا
اسباب جو ضروری تھے اس میں رکھا دیا
یہ آٹھویں تھی پشت رسالتمآبؐ میں
زینبؑ کا فاصلہ تھا بہت کم جناب میں
ہو کر اسیر آیا حرم کا جو کارواں
آگاہ تھے لعیں کہ نبیؐ کی نواسیاں
ہے محملوں کے اونٹوں پہ کل کی خوزادیاں
عالم کے مقتدیٰ کو بنایا تھا ساربان
رنجیر و طوق بھاری پنہایا امام کو
کانٹوں پہ پا پیادہ چلایا امام کو

Scanned with CamScanner

پیشِ نظر عزیزوں کے سر تھے لہو میں تر
کیوں کر نہ روئے آہ لٹے جس کا سارا گھر
تاکید تھی کہ روئے نہ کوئی پکار کر
ہر اک قدم پہ درپئے ایذا تھے اہلِ شر
بالوں سے منہ چھپائے اسیر جفا گئے
کوفہ سے شہر شام تلک بے ردا گئے

القصہ جب اتر چکیں خاتون محترم
بیٹھیں نہ فرش پر تھیں برابر کہ ایک دم
ہر گھر سے آئی رونے کی آواز دم بہ دم
گھبرا کے یہ کنیزوں سے بولیں بچشمِ نم
دریافت کر تو جا کے کہ کیا واردات ہے
جس کا یہ غم ہے کون سا وہ خوش صفات ہے

استادہ ڈیوڑھی پر تھے محبِ شہِ انام
ان لوگوں سے جو جا کے یہ اس نے کیا کلام
منتظر ہیں میری بی بی تعجب کا ہے مقام
باشندے یاں کے کیوں ہیں سیہ پوش سب تمام
مشتاق ہیں برادر عالی مقام کی
بتلاؤ خیریت جو سنی ہو امام کی

کس بادشہ کے غم میں خلائق ہے اشکبار
کون اٹھ گیا جہان سے جو تم ہو سوگوار
خاموش سب رہے نہ کیا حال آشکار
دریافت کرایا آپ نے جب ان سے چند بار
بیکس کا ذکر آ گیا کیوں دل کو کل پڑے
چاہا چھپانے کو مگر آنسو نکل پڑے

کی عرض کس زباں سے کہیں آپ کے غلام
کہہ دیجئے یہ جا کے کہ اے خواہرِ امام
صدمہ یہ جانگزا ہے جو روتے ہیں صبح و شام
ہم بے امام ہو گئے مارے گئے امام
مامون نے مٹا دیا ہم سب کے چین کو
زہرِ دغا سے مارا شہِ مشرقین کو

اس حادثہ کی جب سے خبر ہم نے پائی ہے
دنیا سیہ نظر میں ہے تاریکی چھائی ہے
دل چاک غم سے ہیں صفِ ماتم بچھائی ہے
ملعون نے جو شمع امامت بجھائی ہے
یہ غم نہیں کسی کا یہ ہے غم امام کا
گھر گھر بپا ہے شہر میں ماتم امام کا

روتی ہوئی حبیبہ گئی حال سب کہا
سنتے ہی اس خبر کو جگر چاک ہو گیا
سر پیٹ کر پکاریں کہ اے وا محمداؐ
مہماں بلا کے بھائی سے ظالم نے کی دغا
لہجے خبر میں عالمِ غربت میں لٹ گئی
بیکس بہن یہ اپنے برادر سے چھٹ گئی

کرتی تھیں بین ہائے مرے قدرداں اَخی
میرے حسین میرے فصیح البیاں اَخی
حاجت روائے خلق امام زماں اَخی
افسوس خواہر آپ کو ڈھونڈھے کہاں اَخی
جب آئی میں قریب جہاں سے گزر گئے
موجود کیا مدد کو شہِ کربلا نہیں

Scanned with CamScanner

تنہا تڑپ تڑپ کے زمانہ سے چل بسے
خواہر نہ پاس تھی نہ عزیز و رفیق تھے
سب گھر تباہ ہو گیا مرنے سے آپ کے
ارمان میرے خاک میں سب مل کے رہ گئے
غربت میں جاں پہ بن گئی آفت گزر گئی
اے کاش پہلے آپ کے میں کیوں نہ مر گئی

ہے ہے شہید زہرِ دغا میرے ذی وقار
غربت پہ صدقے آپ کی مظلومی پہ نثار
اس بیکسی میں کون تھا حضرت کا غم گسار
غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مجھ پہ ایک بار
سننے کو یہ سنانی دل افگار رہ گئی
خواہر کے دل میں حسرتِ دیدار رہ گئی

روئیں بلک بلک کے تو غش کھا کے گر پڑیں
پرسہ کو سب زنانِ عرب جمع ہو گئیں
سب مل کے ساتھ روتی تھیں تسکین دیتی تھیں
لیکن تسلی خاطر ناشاد کو نہیں
پیہم غش آ رہے تھے یہ حالت تباہ تھی
نالے رضاؑ رضاؑ کے تھے اور لب پہ آہ تھی

اس روز سے فزوں ہوئی بس شدت بخار
نیند اڑ گئی تھی آنکھ نہ لگتی تھی زینہار
ایک ہوک سی جگر میں یہ اٹھتی تھی بار بار
روتی تھیں منہ کو ڈھانپ کے شدت سے زار زار
مجروح دل جگر تھا چھری غم کے پار تھی
آب و غذا بھی ان کو بس اب ناگوار تھی

تکیہ سے پھر تو سر کا اٹھانا محال تھا
اک دم سکون دل کو نہ تھا بس یہ حال تھا
آنکھیں تھیں بند ضعف سے اور جی نڈھال تھا
ہنگامِ نزع تک یہی رنج و ملال تھا
جاری تھے اشک آنکھوں سے یاد امام میں
روتی ہوئی پہنچ گئی دارالسلام میں

کل سولہ روز آپ رہیں تم میں میہماں
دن سترھواں جو آیا سدھاریں سوئے جناں
غُل پڑ گیا کہ اٹھ گئیں شہزادی زماں
مولا کے سوگوار سے خالی ہوا جہاں
صدمہ نہ اٹھ سکا جو دلِ بیقرار سے
ملحق ہوئیں برادر عالی وقار سے

پھیلی تمام شہر میں رحلت کی جب خبر
روتے ہوئے محبِ علیؑ نکلے ننگے سر
سامان دفن کرنے لگے سب بہ چشم تر
عصمت پناہ بیبیاں سب آئیں نوحہ گر
روتی ہیں اس طرح سے کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
جیسے کسی عزیز کی میت پہ روتے ہیں

کہتی ہیں بی بی منہ سے ردا کو ہٹایئے
روپوش کیوں ہوئیں سبب اس کا بتایئے
کچھ حال درد دل ہمیں اپنا سنایئے
پرسے کو آئیں بیبیاں روکر رُلایئے
بی بی بغیر بزمِ عزا سونی ہو گئی
بے رونقی امامؑ کے ماتم میں ہو گئی

Scanned with CamScanner

غسل و کفن کا ہو گیا سامان جب بہم
سبقت یہ عورتوں میں تھی نہلائیں ان کو ہم
اُٹھیں شریف بیبیاں اُس دم برنج و غم
میت اٹھا کے حجرے میں لائیں بچشمِ نم
رخت عزا جونہی تنِ بیجاں سے بڑھ گیا
اترا سیاہ لباس تو کہرام پڑ گیا

حجرے کو بند کر کے دیا غسل اور کفن
پہنا چکیں کفن تو پکاریں بصد محن
آکر کرو زیارتِ شہزادی زمن
ہوگی نہاں یہ چاند سی تصویر دفعتاً
ماتم سرا یہ گھر ہوا سب آکے روئیں گے
بی بی نہ اب ملیں گی اگر جان کھوئیں گے

دوڑیں تمام بیبیاں اس وقت ننگے پا
پھر اک ہجوم ہو گیا رونے کا غُل اُٹھا
ماتم دھڑا دھڑی کا وہ فریاد کی صدا
وا فاطمہؑ کا شور کبھی وا امامؑ کا
تابوت آیا جس گھڑی باہر سے گھر تلک
لائیں زن عرب اسے حجرے کے در تلک

میّت مخدرات نے تابوت میں رکھی
اور بند کر کے بعد ردا اس پہ ڈال دی
آئے اٹھانے کے لئے دیندار و متقی
اٹھا جنازہ جب تو قیامت کی تھی گھڑی
جو خاص ہے کنیز پچھاڑیں وہ کھاتی ہے
سر پیٹ کر وہ ساتھ جنازے کے جاتی ہے

روتے ہیں شیعیانِ علیؑ دھاڑیں مار کر
غُل ہے کہ ہائے خواہر سلطانِ بحر و بر
آگے تو غول مردوں کا وہ ہے برہنہ سر
اور پیچھے پیچھے عورتیں جاتی ہیں نوحہ گر
جس جا مزار تھا وہاں تابوت لے گئے
کچھ مصلحت سے رکھ کے جنازہ چلے گئے

اہلِ وطن ہیں دور کوئی اقربا نہیں
میت اتارے کون امامِ رضاؑ نہیں
ظاہر میں بے کسی ہے پہ باطن میں کیا نہیں
موجود کیا مدد کو شہِ کربلا نہیں
زہراؑ کی روح خلد سے تشریف لائی ہے
روحِ رضاؑ بھی طوس سے لینے کو آئی ہے

احکام میت عورتوں نے سب ادا کیے
میت اتاری قبر میں تختے لگا دیے
جب قبر بند ہو چکی پھر مرد آ گئے
آکر شریک دفن وہ پھر سب کے سب ہوئے
دے دے کے مٹی روئے غریب و امیر سب
یاں تک کہ شہر قم کے صغیر و کبیر سب

تادیر گرد قبر پہ ماتم بپا رہا
لائی کشش وطن سے یہاں وا مصیبتا
خاتون روک لے قلم اب حق سے کر دعا
پہنچا دے مجھ کو منزل مقصد پہ اے خدا
ہو کر میں کربلا سے خراسان جاؤں پھر
قم کی ضریح پاک سے آنکھیں لگاؤں پھر

Scanned with CamScanner

محمد وفی، وفؔی

بابائے منطق وفلسفہ اور آبروئے خطابت مولانا سید محمد مہدی ناشادؔ زید پوری کے فرزند اور استادی مولانا سید اخلاق مہدی (مدرس اعلیٰ سلطان المدارس لکھنؤ) کے چھوٹے بھائی سید محمد وفی، وفؔی زید پوری ۱۱ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۹ء میں اپنے وطن زید پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مولوی سید محمد سجاد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بابائے منطق مولانا سید محمد مہدی کے ریاست حسن پور، سلطان پور سے وابستگی کے بعد وفؔی سلطان پور چلے گئے اور وہاں حجت الاسلام مولانا بختاور علی مرحوم سے مزید تعلیم حاصل کی۔ مولوی عطا مہدی زید پوری کے مطابق تقریباً ۲۵ رسال کی عمر میں شاعری کا آغاز ہوا اور اپنے والد سے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے لاتعداد قصیدے، سلام، نوحے، مخمس، مسدس، قطعات سواریاں، رباعیاں اور غزلیں کہی ہیں۔ ان کے انتقال (۲۰ ررمضان ۱۴۱۹ھ/دسمبر ۱۹۹۹ء) کے بعد شائع شدہ کتابچہ 'کلام وفی' کے پیش لفظ میں سید محمد رضا عابد نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

'وفؔی نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور قدرتِ فن کا مظاہرہ کیا لیکن زید پور کی مخصوص ومنفرد ادبی روایت اور اپنے خاندان کے زبردست دینی ماحول کے زیر اثر دینی اصناف سخن پر زیادہ توجہ کی۔ ان کے لاتعداد یادگار نوحے اور قصائد اس کے گواہ ہیں جو بستی کی ادبی

فضا میں زندہ وتابندہ رہے ہیں۔'

وفؔی کے انتقال پر متعدد شعراء کرام نے قطعات تاریخ کہے جن میں مونسؔ زید پوری، ساحرؔ زید پوری اور مولانا رضا ساجدؔ زید پوری اہمیت کے حامل ہیں۔

'انوارِ زید پور' میں عطا مہدی زید پوری نے ان کے متعدد سلام، مخمس اور مسدس کے نمونے پیش کئے ہیں۔ امام حسینؑ کے حال کا جو مرثیہ ہے اس میں رخصت آخر کے منظر کو وفؔی نے بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس منظر نامے میں بین کا تاثر قابل دید ہے:

ہلا کے شا نے کہا ہوشیار رہو بیٹا
ملو گلے تو یہ بے کس سوار رہو بیٹا
مزاج کیسا ہے کیوں بیقرار رہو بیٹا
کراہتے ارے کیوں بار بار رہو بیٹا
سنی جو غش میں یہ بیمار نے صدائے پدر
تو آنکھیں کھول کے دیکھا کہا کہ ہائے پدر

باپ اور بیٹے کی گفتگو، اسرار امامت کی سپردگی کے بیچ امام حسینؑ کی وصیت کو وفؔی نے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے:

ہے تم سے میری وصیت یہ عابد مضطر
جو قید شام سے جانا وطن کبھی چھٹ کر
ہمارے چاہنے والوں سے کہنا اے دلبر
مصیبتوں میں بھی بھولے نہیں تمہیں سرور
ہمارے دوستوں سے یہ پیام کہہ دینا
میرے محبوں سے میرا سلام کہہ دینا
یہ دوسری ہے وصیت اے سید سجاد
پنہائیں بیڑیاں بھاری جو یہ ستم ایجاد

Scanned with CamScanner

سوائے شکر خدا کے نہ کچیو فریاد
وگرنہ ہووے گی محنت ہماری سب برباد
ستم ہوں جتنے بھی صبر و رضا سے کام رہے
خیال امت عاصی ہر ایک گام رہے
یہ کہہ کے شاہ ہدیٰ آئے خیمے کے باہر
جو دیکھا ڈیوڑھی ہے خالی تو بولے یہ سرور
کہاں ہوائے مرے شیر و کدھر گئے صفدر
نہ آئی جب کوئی آواز بولے شہ رو کر
نہ لشکرے نہ سپاہے نہ کثرت الناسِ
نہ قاسمے نہ علی اکبرے نہ عباسِ

ایک دوسرے مرثیے میں وفؔی کی زبانی حضرت امام حسینؑ کا تعارف ملاحظہ فرمائیں:

کر دیا اسلام کو اسلام جس نے وہ حسینؑ
کوششیں کیں کفر کی ناکام جس نے وہ حسینؑ
دین کے بگڑے بنائے کام جس نے وہ حسینؑ
جد کا روشن کر دیا ہے نام جس نے وہ حسینؑ
ساقیا پھر آج مئے دے تو اسی کے نام کی
پی کے جس کو بے خطر خدمت کروں اسلام کی

ساقی نامہ اردو مرثیے کا ایک ایسا جزو ہے جسے بیشتر مرثیہ نگاروں نے نظم کیا ہے۔ زید پور کے زیادہ تر مرثیہ نگاروں نے اسے اپنے مراثی میں جگہ دی ہے۔ وفؔی نے بھی اپنے پیشرو مرثیہ نگاروں کا تتبع کیا ہے۔ ساقی نامہ کے ذیل کے بند وفؔی کی قادر الکلامی کے بین ثبوت ہیں:

خود جسے پیتے پلاتے تھے پیمبر وہ شراب
جس کے ساغر پہ لکھا ہے حب حیدر وہ شراب
جو مزے سے پیتے تھے سلمان و بوذر وہ شراب
جس کے عاشق تھے بہت مقداد و قنبر وہ شراب
طاہر و اطہر جو ہے ساقی مجھے وہ مئے پلا
خلد کی رہبر جو ہے ساقی مجھے وہ مئے پلا
کربلا میں مست تھے جس سے بہتر وہ شراب
جان پر کھیلے جسے پی کر دلاور وہ شراب
جس کے خاطر حر نے چھوڑا اپنا لشکر وہ شراب
خود پلاتے تھے جسے سبط پیمبر وہ شراب
وہ پلا صہبا جسے عابس اور عامر پیتے تھے
شوق سے جس کو بہت ابن مظاہر پیتے تھے
حضرت عباس تھے جس مئے کے خوگر وہ شراب
نوش کرتے رہتے تھے جس مئے کو اکبر وہ شراب
ساقیا پیتے تھے جس کو شہ کے یاور وہ شراب
پاک اور شفاف ہے جو نزد داور وہ شراب
پی کے جسکو رات دن اس مئے کا دم بھرتا رہوں
بے خودی میں بھی طواف مئے کدہ کرتا رہوں

Scanned with CamScanner

سید یاد حسن، یادؔ

یادؔ زید پوری کا تعلق زید پور کے ایک تعلقدار گھرانے سے ہے۔ ان کے جد خان بہادر سید خادم حسین نامور رئیس تھے، جن کے دادا سید سبز علی سلطان احمد شاہ کے دربار میں منصبِ چار صدی پر فائز تھے اور والد سید نوازش علی صفدر جنگ کے عہد کے حاکم تھے۔ خود خادم حسین کمسنی میں یتیم ہو گئے لیکن بڑے ہو کر سدھور کے ناظم ہوئے۔ حکومت وقت کے سرکش راجہ سورج پور کو شکست دینے اور حاضر دربار کرنے کے عوض نواب سعادت علی خاں نے انہیں خطاب خان بہادر، خلعت اور تلوار بخشی، ان کی محل سرا زید پور کے محلہ پچھلی میں واقع ہے اور بڑی سرکار کے نام سے موسوم ہے۔ اسی احاطہ میں ان کی بنائی ہوئی مسجد اور امام باڑہ واقع ہے۔ ان کے بیٹے سجاد حسین ہُر ہُر پور ضلع بہرائچ کے چکلہ دار تھے۔ سجاد حسین کے بیٹے بنیاد حسین (تعلقدار) زید پور کے مقتدر رئیسوں میں سے تھے۔ ان کی عظمت یا شہرت کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کا خاندان، محل سرا اور امام باڑہ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔

سید یاد حسن میر بنیاد حسین تلقدار کے بیٹے سید مستفاد حسین کے پوتے اور سید محمد حسنین برادر محسنؔ زید پوری کے فرزند اکبر تھے۔ یاد حسن کے بڑے والد سید عابد رضا جج زید پور کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے۔ سید یاد حسن کو اپنے خاندان کے علاوہ جملہ تعلقدارانِ اودھ و تاریخ اودھ کی

بے انتہا معلومات تھی۔ ان کی ولادت ۱۱ر رمضان ۱۳۵۲ھ کو زید پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ بعدہٗ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا رخ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی ایس سی کرنے کے بعد ملازمت کا آغاز ہوا اور ان کے صاحب زادے سید کاظم اصغر رضوی کے مطابق پی ڈبلیو ڈی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ سے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

سید یاد حسن کو ملازمت کی مصروفیت کے سبب شاعری کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا مگر جو کچھ کلام ہے وہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ وہ محسنؔ زید پوری کے تربیت یافتہ اور ان کے حقیقی ادبی وارث تھے۔ رٹائرمنٹ کے کچھ دنوں بعد ۵ر ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور تدفین ان کے آبائی قبرستان زید پور میں ہوئی۔ ساجد اصغر ساجدؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

ہائے اک نیک خو و نیک چلن — کر گیا مبتلائے رنج و محن
کر گیا سو نا عرشۂ منبر — مرثیہ خوان شاہ تشنہ دہن
بہر سال وفات لکھ ساجد — ہوں گے باغ جناں میں یادؔ حسن

۱۴۳۱ھ

سید یاد حسن شاعری میں اپنے عم محسنؔ زید پوری کے شاگرد تھے۔ قصیدہ، سلام، رباعی اور قطعہ میں طبع آزمائی کی۔ ان کا ایک مرثیہ ماہنامہ اصلاح لکھنؤ کے محرم نمبر ۱۴۱۴ھ/ جولائی اگست ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا ہے جس کے آخر میں 'اصلاح مرثیہ و سلام، الحاج راجہ سید بادشاہ حسین رزمؔ والی ریاست لور پور' تحریر ہے۔ اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاد حسن، محسنؔ زید پوری کے انتقال کے بعد راجہ لور پور سے اصلاح لیتے تھے جو مرثیہ کے ایک اہم شاعر تھے۔

سید یاد حسن مرثیہ گوئی میں اپنے عم محترم محسنؔ زید پوری کے ہم خیال ہیں۔ محسنؔ نے کہا ہے:

Scanned with CamScanner

خیال تازہ مضامیں کی جستجو میں رہے نہ ہمنوائی کا انداز گفتگو میں رہے

ہر اک سے اپنا طریقہ بیاں کا بدلا ہو
کلام میں لب ولہجہ زباں کا بدلا ہو
زمیں کا رنگ سماں آسماں کا بدلا ہو
چلن روانی کا طبع رواں کا بدلا ہو

دکھائیں مصرع دلکش کشش جداگانہ
ہے اپنے باغ سخن کی روش جداگانہ

چنانچہ یادؔ نے بھی اپنے مرثیوں میں جداگانہ روش اپنائی۔ انہوں نے امام حسینؑ کا جو مرثیہ کہا ہے اس کے چہرے میں دورِ حاضر کے مسائل اور واقعات کو پیش کیا ہے۔ پٹرول کے نشے میں چور عرب حکمرانوں کی اخلاقی پستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان کا کچھ ظرف نہیں گر چکے ہیں حد سے سوا
ہیں شراب اور گناہوں سے گھرے سر تا پا
ان کی طاقت نہیں کیا اپنا جمائے سکّا
سمجھے پٹرول کی دولت کو یہ اپنی عقبا

پھر کے کعبے سے بتوں سے یہ وفا کرنے لگے
مغربی جنت شداد کا دم بھرنے لگے

ان کو کیا اس سے غرض مرضیٔ معبود ہے کیا
جو خدا چاہتا ہے گوہر مقصود ہے کیا
راہِ اسلام ہے کیا وادیٔ بہبود ہے کیا
کون ہے حق کا نبی کعبے کا مولود ہے کیا

بش کو حلّال مہم مثلِ خدا مانتے ہیں
یہ یہود اور نصاریٰ کی رضا چاہتے ہیں

مرثیے میں شہدائے کربلا کے تعارف کے علاوہ امام عالی مقام کی شہادت کا منظر نامہ ترتیب دیتے ہوئے یادؔ نے جو انداز اختیار کیا ہے اس میں بین کا تاثر قابل توجہ ہے:

لاش پامال ہوئی سبط نبی کی بے سر
بے کفن رن میں رہے سب شہدائے اطہر
ختم اب یادؔ کرو مرثیہ، جلتا ہے جگر
اپنے خالق سے دعا مانگو کہ میرے داور

جلد تعمیر ہوں روضوں کی وہی شوکت ہو
وہی حج دھج ہو وہی شان وہی زینت ہو

Scanned with CamScanner

سید شہزاد حسین شہزادؔ

سید شہزاد حسین، بنیاد حسین تعلقدار کے پوتے محسنؔ زیدپوری کے صاحب زادے ہیں۔ شہزاد حسین سے راقم کی متعدد ملاقاتیں تھیں۔ مرحوم بڑے خلیق، وضعدار اور محبِ اہل بیت تھے۔ شعر وسخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ قصیدہ، نوحہ، سلام اور قطعات تاریخ خوب کہتے تھے۔ بقول سید یاد حسن مرحوم برادر زادہ محسنؔ زیدپوری 'شہزادؔ زیدپوری نے بھی پانچ مکمل مرثیہ، بہت سے نوحے، سلام اور قصیدے نظم کئے ہیں۔' گویا شہزادؔ زیدپوری محسنؔ کے اس راستے پر گامزن رہے جس کی طرف محسنؔ نے اپنے ایک مرثیے میں اشارہ کیا ہے:

یا خدا مرثیہ گوئی کا چلن ختم نہ ہو
نکتہ داں ایسے بہم ہوں کہ یہ فن ختم نہ ہو
رونق محفل ارباب سخن ختم نہ ہو
ستم دست خزاں سے یہ چمن ختم نہ ہو
گلفشانی سے گلستاں نہ یہ مجبور رہے
واپس آجائے بہار اور خزاں دور رہے

شہزادؔ زیدپوری ۴؍جون ۱۹۲۸ء مطابق ۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۶۴ء کو زید پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ میں شیعہ کالج سے مزید تعلیم حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد تاحیات وطن میں رہے۔ اپنے والد کے ساتھ زید پور اور اطراف کی

محافل و مجالس میں برابر شریک رہتے تھے۔ محسنؔ زیدپوری زیادہ تر اپنا کلام انہی سے پڑھواتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعر فہمی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا اور اپنے والد کے زیر سایہ شاعری کی ابتدا کی۔ مرثیوں کے ساتھ ساتھ جملہ اصناف سخن میں مہارت حاصل کی۔ ان کا کلام ان کی بھانجی مشہور شاعرہ پروینؔ زیدپوری کے پاس محفوظ ہے۔ جن کے علیل ہونے کے سبب کوشش بسیار کے باوجود ان کا کلام راقم آثم کے مطالعہ میں نہیں آسکا۔ شہزادؔ زیدپوری نے ۸؍شعبان ۱۴۲۷ھ مطابق ۳؍دسمبر ۲۰۰۶ء کو انتقال کیا۔ سید ساجد اصغر ساجدؔ زیدپوری نے تاریخ کہی:

مانتا تھا سرمایۂ ہستی دنیا میں
الفت زہرا و حیدر حب حسنین
لکھ دو سن ہجری میں ساجدؔ سالِ وفات
گلشن جنت میں گئے شہزاد حسین

۱۴۲۷ھ

شہزادؔ زیدپوری کو اپنے بزرگوں کی اس روایت پر فخر تھا جس کے روح رواں فراستؔ اور یونسؔ تھے۔ چنانچہ ایک سلام کے مقطع میں کہتے ہیں:

فقط اس بات پہ ہے ناز مجھے بھی شہزادؔ
ایک ثنا خوان حسینؑ جگر افگار بھی ہوں

بطور مثال ایک قطعہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے جس سے ان کی شعر گوئی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

دل شمع امامت کا جو پروانہ بنے گا
وہ ذرۂ خاکِ درِ جانانہ بنے گا
شہزادؔ غمِ شہ میں جو نکلے گہر اشک
ان موتیوں سے سجدۂ صد دانہ بنے گا

Scanned with CamScanner

شہزاد زید پوری کے پس ماندگان میں دو بھانجے سید نہال رضوی (سابق چیرمین فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ) اور سید علی کبیر اور تین بھانجیاں ہیں۔ ان کی بڑی بھانجی پروین زید پوری ایک عمدہ اور خوش فکر شاعرہ ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور 'آئینۂ عقیدت' کے نام سے ان کے مراثی کا مجموعہ رثائی ادب میں قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔ جناب نہال رضوی کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی ہے اور اپنے بزرگوں کی روایت کو زندہ کئے ہوئے ہیں۔

حواشی و استدراک

۱ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی؛ کراچی: ۱۹۹۴ء: ص ۹۴ ۷

۲ تجلیات (سوانح مفتی میر محمد عباس) عزیز لکھنوی: نظامی پریس لکھنؤ: ۱۳۴۴ھ: ص ۹۱_۹۰

۳ محسن زید پوری اور ان کی مرثیہ گوئی: سید سبط محمد نقوی: سرفراز لکھنؤ (رجب نمبر ۱۳۹۶ھ) ص ۱۲۳

۴ سید شبیہ الحسن نونہروی (مقدمہ) مشمولہ یونس زید پوری حیات اور شاعری: سید فرید مہدی رضوی: نامی پریس لکھنؤ: ۱۹۸۹ء: ص ۷

۵ افکار و مسائل: سید احتشام حسین: لکھنؤ: سنہ ندارد: ص ۹۷

۶ دبستان دبیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی: لکھنؤ: ۱۹۶۶ء: ص ۳۴۰

۷ شجرات طیبات: سید ظہور الحسن فروغ سیتاپوری: امیر المطابع سیتاپور: ۱۹۱۶ء: ص ۳۳_۳۰

۸ محسن زید پوری نے سید محمد رضا عابد سے بیان کیا تھا کہ یہ تاریخ یونس کی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ پہلے مشہور عمارتوں، شخصیتوں کی تاریخیں لوگ کہہ لیا کرتے تھے۔ تاکہ ان سے سنیں یاد رہ جائیں (عابد حیدری)

۹ محسن زید پوری اور ان کی مرثیہ گوئی: سید سبط محمد نقوی: ص ۱۲۳

۱۰ تذکرۂ حسینی: میر حسین دوست سنبھلی: مترجمہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی: ایم آر آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۰۸ء: ص ۳۲۹

Scanned with CamScanner

۱۱ تذکرۂ بے نظیر ص ۱۳۲ بحوالہ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان: ڈاکٹر نریندر بہادر سری واستو نامی پریس لکھنؤ: ستمبر ۱۹۸۳ء: ص ۶۹

۱۲ گلدستۂ معانی: غالب زید پوری: مطبوعہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۸ء: مطبع اثنا عشری لکھنؤ

۱۳ تجلیات: عزیز لکھنوی: ص ۳۸۵_۳۸۴

۱۴ مطلع انوار: مرتضیٰ حسین فاضل: کراچی: ۱۹۸۱ء ص ۴۵۰

۱۵ تذکرۂ تکملہ نجوم السماء (جلد اول) مرزا محمد مہدی لکھنوی: مکتبہ بصیرتی قم ایران: ۱۳۹۷ھ: ص ۴۶۹

۱۶ شجرات طیبات: ص ۳۴۳_۳۴۲

۱۷ مطلع انوار: مرتضیٰ حسین فاضل: ص ۷۶۶

۱۸ تذکرۂ بے بہا: مولانا محمد حسین نوگانوی: جید برقی پریس دہلی: ۱۶/اپریل ۱۹۳۱ء: ص ۲۶۸

۱۹ تجلیات: عزیز لکھنوی: ص ۳۷۶_۳۷۵

۲۰ ایضاً: ص ۳۷۶_۳۷۵

۲۱ مطلع انوار: مرتضیٰ حسین فاضل: ص ۳۹۶

۲۲ تجلیات: عزیز لکھنوی: ص ۹۱ و مطلع انوار: مرتضیٰ حسین فاضل: ص ۳۹۷_۳۹۶

۲۳ تعارف از ڈاکٹر محمد علی رضوی، ایمان بالغیب (محمد شاد، شاد زید پوری) شاد اکادمی کراچی: ۱۹۵۷ء: ص ۱۳_۱۲

۲۴ تعارف از عالم مہدی زید پوری: تبرکات ہاشم: ہاشم زید پوری: ۱۹۹۳ء: ص ۱۴

۲۵ ایضاً: ص ۳

۲۶ العلم (دوماہی) نعت خیر المرسلین نمبر: بمبئی: اگست ۱۹۹۴ء: ص ۹۴

۲۷ دانش صاحب نے وقار کو تلمیذ نفیس لکھا ہے جبکہ فروغ سیتاپوری نے شجرات طیبات میں وقار کو شاگرد انیس ہی لکھا ہے۔ فروغ خود نفیس کے شاگرد تھے اگر وقار نفیس کے شاگرد ہوتے تو فروغ اس کا تذکرہ ضرور کرتے (عابد حیدری)

۲۸ ادبی میراث: علی احمد دانش: نیشنل آفسیٹ پریس لکھنؤ: ۱۹۹۶ء: ص ۲۱

۲۹ ساہ جی کا امام باڑہ شاہی دور کی تعمیر ہے۔ میر انیس کا مذکورہ مصرع تاریخی نظم کا جزو ہوگا۔ اگر مادہ ہے تو تعمیہ (تدخلہ) یا زبر و بینہ ہوگا (عابد حیدری)

۳۰ ادبی میراث: ص ۲۲

۳۱ شجرات طیبات: سید ظہور الحسن فروغ سیتاپوری: ص ۲۰۷

۳۲ شاگردان انیس: قمقام حسین جعفری: مکتبۂ جعفری کراچی: ۱۹۷۹ء: ص ۱۸۶

۳۳ فیضان انیس: افسر امروہوی: سہ ماہی اردو کراچی (انیس نمبر جلد ۴۶: ۳و۴) ۱۹۷۳ء: ص ۲۷۰

۳۴ تجلیات: عزیز لکھنوی: ص ۹۲_۹۱

۳۵ شجرات طیبات: ص ۲۸۳

۳۶ دبستان دبیر: ص ۳۴۰

۳۷ ایضاً: ص ۳۴۱_۳۴۰

۳۸ ایضاً: ص ۴۱۱

۳۹ مداح آل محمد مولانا یونس زید پوری: م۔ر۔ عابد: الواعظ مئی و جون ۱۹۸۰: ص ۱۹

۴۰ سید عنایت حسین جلالوی: پیشکش مشمولہ آہ و بکا: نجم زید پوری: مجلس ملی پاکستان کراچی: ص ۷

۴۱ دبستان دبیر: ص ۱۷۹

۴۲ ایضاً: ص ۵۲۴

۴۳ اردو مرثیہ: علی عباس حسینی: ص ۱۱۷

۴۴ ایضاً: ص ۱۳۶_۱۳۵

۴۵ دبستان دبیر: ص ۵۲۳

۴۶ یونس زید پوری حیات اور شاعری: سید فرید مہدی رضوی: ص ۷

۴۷ دبستان دبیر: ص ۵۳۳

۴۸ دبستان دبیر: ص ۶۱۹

۴۹ ایضاً ص ۶۲۱

Scanned with CamScanner

۵۰ نعت خیر المرسلین نمبر (دوماہی العلم) بمبئی: اگست ۱۹۹۴ء: ص ۱۴۰_۱۳۹

۵۱ ایضاً: ص ۱۶۵۵_۱۶۴

۵۲ دبستان دبیر: ص ۵۶۴

۵۳ ایضاً: ص ۶۳۵

۵۴ ایضاً: ص ۶۳۶

۵۵ ایضاً: ص ۶۳۸

۵۶ ایضاً: ص ۶۳۹

۵۷ ایضاً: ص ۶۴۴_۶۴۳

۵۸ ایضاً: ص ۶۵۶_۶۵۵

۵۹ ایضاً: ص ۶۲۳_۶۲۲

۶۰ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ص ۸۰_۷۹

۶۱ شجرات طیبات؛ فروغ سیتاپوری: امیر المطابع سیتاپور: ۱۹۱۶ء: ص ۱۴۸

۶۲ یادگار زید پور: سید سردار مہدی رضوی: سلطان آرٹ پریس کراچی: محرم ۱۳۹۳ھ: ص ۱۰۱_۹۹

۶۳ سید سبط محمد نقوی نے محسن کی تاریخ ولادت ۹ رجب تحریر کیا ہے جبکہ دبستان دبیر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اور 'یونس زید پوری حیات اور شاعری' میں سید فرید مہدی رضوی نے بھی ۷ رجب ہی تحریر کیا ہے۔ (عابد حیدری)

۶۴ جدید مرثیے کے محرکات و اسالیب: ڈاکٹر وحید اختر: مشمولہ دوماہی العلم ممبئی (مرثیہ و سلام نمبر) جون ۱۹۹۳ء: ص ۵۰

۶۵ مولانا باقر جوراسی کے مرثیے: پروفیسر نیر مسعود رضوی: ماہنامہ اصلاح لکھنؤ: نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء: ص ۶۷

مختصر سوانحی خاکہ

نام	: عابد حسین
قلمی نام	: عابد حسین حیدری
والد	: جناب یعقوب حسین ابن محمد یوسف کربلائی مرحوم
والدہ	: محترمہ خاتون بی بی بنت جناب محمد فرید مرحوم
اہلیہ	: شہزادی بیگم
بیٹیاں	: زینت زہرا، ایلیاز ہرا
بیٹے	: محمد مفید، کمیل عابد
آبائی وطن	: محلّہ نیا پورہ شیو پور گاڑا پوسٹ کوپا گنج ضلع مئو (یو. پی)
پیدائش	: ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو پا گنج۔ مئو۔

ابتدائی تعلیم:

میری ابتدائی تعلیم مدرسہ امامیہ کوپا گنج میں ہوئی اور مولوی جاوید مرحوم سے اردو اور دینیات کی تعلیم حاصل۔ قرآن کا ناظرہ حاجی عبید اللہ انصاری نے ختم کرایا۔ بعدہٗ مدرسہ مصباح العلوم کوپا گنج سے درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی استاد محترم ماسٹر عزیز الرحمٰن کی خصوصی توجہ سے درجۂ پنجم میں راقم نے پورے بلاک میں امتیازی نمبر حاصل کیا۔ بعدہٗ مدرسہ جامع العلوم کوپا گنج سے عربی اول تک تعلیم حاصل کی۔ اس درمیان عربی و فارسی بورڈ الٰہ آباد سے منشی کا امتحان شبلی کالج اعظم گڑھ سے دیا۔ جس میں ممتاز نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۲ء

Scanned with CamScanner

میں میرا داخلہ لکھنؤ کی مشہور علمی درسگاہ سلطان المدارس میں کرایا گیا اور یہیں سے میری صلاحیتوں میں نکھار آیا۔ مدرسہ سلطان المدارس سے سند الافاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد دو ماہی العلم کی ملازمت کے سلسلے میں ممبئی چلا گیا جہاں ۱۹۹۵ تک ملازمت کی (العلم کے مدیر مشہور محقق مجاہد آزادی علی جواد زیدی تھے) بعدہٗ ۱۹۹۵ء میں صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شعبۂ علوم مشرق یہ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر، دبیر کامل اور فاضل تفسیر کے امتحانات دیئے اور ان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم :

بی۔اے	۱۹۸۹ء	شیعہ کالج لکھنؤ
ایم۔اے (اردو)	۱۹۹۱ء	لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ
نیٹ (NET)	۱۹۹۶ء	یو۔جی۔سی نئی دہلی
پی۔ایچ۔ڈی (اردو)	۲۰۰۶ء	لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

ملازمت :

☆لکھنؤ میں : پندرہ روزہ ''ہماری توحید'' سے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز ہوا جس کے ایڈیٹر مشہور سماجوادی لیڈر رام منوہر لوہیا کے ساتھی چودھری سید سبط محمد نقوی تھے۔ بعدہٗ ۱۹۸۷ء میں ہفتہ وار 'وظیفہ' لکھنؤ (انجمن وظیفۂ سادات ومومنین) کے جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت ملازمت کی۔ وظیفہ کے ایڈیٹر غلام حسین (آئی اے ایس) سابق وائس چانسلر زینددیوزرعی یونیورسٹی فیض آباد تھے۔

☆ممبئی میں : ۱۹۹۲ء میں چودھری سید سبط محمد نقوی کی ایماء پر مشہور صنعت کار سید اختر حسن رضوی کے ذریعہ نکالے جانے والے رسالہ ''دو ماہی العلم'' میں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ اس رسالے کے مدیر

مشہور محقق وادیب پدم شری علی جواد زیدی مرحوم تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ تک بڑی آب وتاب سے نکلا اور اس کا مرثیہ نمبر و مرثیہ سلام نمبر، شہادت نمبر اور نعت خیر المرسلین نمبر کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

☆لکھنؤ واپسی : ۱۹۹۵ء میں لکھنؤ واپس آکر روز نامہ ''صحافت''، لکھنؤ میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت شروع کی اور اس دوران یونس اختر قدوائی سلامت رضوی، سید طاہر عباس اور عرفان صدیقی جیسے صحافیوں کی رفاقت میں کام کیا۔ ۱۹۹۸ء میں برادر محترم محمد علی کی ایما پر لکھنؤ، دہلی اور ممبئی سے شائع ہونے والے دیوناگری اور اردو اخبار ہفتہ وار جدید مرکز (ایڈیٹر حسام الاسلام صدیقی) میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر ملازمت کی اور یہ سلسلہ ۱۲ر جنوری ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔

☆سنبھل میں

اتر پردیش ہائر ایجوکیشن الہٰ آباد سے منتخب ہوکر بحیثیت لیکچرر ایم۔جی۔ایم کالج سنبھل میں ۱۵ر جنوری ۲۰۰۱ء سے اب تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

انتظامی عہدے :

صدر شعبۂ اردو : ایم۔جی۔ایم۔(پی۔جی) کالج سنبھل ۱۵ر جنوری ۲۰۰۱ء سے اب تک

پروگرام آفیسر : این۔ایس۔ایس۔(یونٹ)، ایم۔جی۔ایم کالج سنبھل ستمبر ۲۰۰۳ء سے مارچ ۲۰۰۷ تک

پراکٹر : ایم۔جی۔ایم کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۲ء سے جون ۲۰۰۷ء تک

چیف پراکٹر : ایم۔جی۔ایم کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۷ء سے اب تک

صدر : ٹیچرس ایسوسی ایشن ایم۔جی۔ایم کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۷ء سے اب تک

Scanned with CamScanner

پی آئی او : ایم.جی.ایم.کالج سنبھل جولائی ۲۰۱۲ء سے اب تک

رکن : سلیبس کمیٹی ایم.جے.پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی ۱۰-۲۰۰۹ء

سکریٹری : انٹر کالجس والی وال چیمپین شپ ایم.جے.پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی ۲۰۰۶ء-۲۰۰۵ء

کنوینر : NAAC کمیٹی ایم.جی.ایم کالج سنبھل ۲۰۱۳ء سے اب تک

کنوینر : U.G.C. رمیڈیل کورسز ۰۹-۲۰۰۸ء ایم.جی.ایم.کالج سنبھل

کنوینر : کیریئر کونسلنگ سیل ایم.جی.ایم.کالج سنبھل ۲۰۱۱ء سے اب تک

رکن : بورڈ آف اسٹڈیز ایم.جے.پی.روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۱ء تک

آبزرور : اتر پردیش B.Ed. کامن ٹیسٹ ۲۰۱۲ء

آبزرور : متحانات ڈسٹینس ایجوکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۴ء تک

(متعدد سیکشن کمیٹی اور انسپکشن کمیٹی میں بحیثیت ممبر)

کتب:

۱۔زراعت ظرفی ۱۹۹۲:

ممبئی میں دوران ملازمت سیفی بک ایجنسی کی فرمائش پر مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف پرائمری ایجوکیشن پونہ کے نصاب کے مطابق اردو میڈیم کے طلبہ کیلئے ترتیب دی۔ایگریکلچر کے موضوع پر پرائمری طلبہ کے لئے اس میں آسان زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ادبیات کشمیر ۱۹۹۴ء:

مشہور محقق و ادیب پدم شری علی جواد زیدی کے ذریعہ کشمیر اور کشمیری

ادیبوں و شاعروں پر لکھی گئی تحریروں کو مرتب کر کے نشاط پریس ٹانڈہ سے شائع کیا اس میں کشمیری ادب پر تفصیلی مقدمہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔اس کتاب پر متعدد تبصرے شائع ہوئے۔

۳۔علم سیاست ۱۹۹۵ء:

دوران ملازمت ممبئی میں مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن پونہ کے نصاب کے مطابق انٹر میڈیٹ کلاس کے طلبہ کے لئے تحریر کی گئی ہے جسے سیفی بک ایجنسی ممبئی نے شائع کیا۔

۴۔علم نفسیات ۱۹۹۵ء:

مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن پونہ کے نصاب کے مطابق انٹر میڈیٹ کے سائکالوجی کے طلبہ کے لیے لکھی گئی۔جسے سیفی بک ایجنسی ممبئی نے شائع کیا ہے۔

۵۔ارمغان محسن ۱۹۹۹ء:

فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے سابق چیرمین نہال رضوی کے اشتراک سے مشہور مرثیہ گو محسن زید پوری کے مراثی کا انتخاب ہے جس پر تفصیلی مقدمہ راقم کے ذریعہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔اس سے زید پور کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔یہ کتاب فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی اور اس پر متعدد تبصرے بھی شائع ہوئے۔

۶۔اردو میں شخصی مرثیے کی روایت ۲۰۰۸ء:

میرا تحقیقی مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D.) کی ڈگری تفویض کی ہے۔یہ مقالہ ایم.آر پبلی کیشنز

Scanned with CamScanner

نئی دہلی سے شائع ہوا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس موضوع پر باقاعدہ یہ پہلی کتاب ہے اس سے قبل چند مضامین ہی دستیاب تھے۔ اس میں شخصی مرثیہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کربلائی مرثیے کے ساتھ ساتھ شخصی مرثیہ بھی شانہ بشانہ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انعام سے نوازا اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔ اس پر متعدد تبصرے بھی شائع ہوئے۔ پروفیسر ثوبان سعید نے اس کتاب پر بہت تفصیلی تبصرہ تحریر کیا ہے اور اسے شخصی مراثی کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے۔ اس تبصرہ کو دو ماہی اکادمی لکھنؤ نے مضمون کی شکل میں شائع کیا۔ مشہور محقق و ادیب ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اسے ''تلاش و تحقیق'' کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

۷۔ علی جواد زیدی شخص اور شاعر ۲۰۰۹ء:

مشہور محقق علی جواد زیدی کی شخصیت اور شاعری پر محیط پر اس کتاب کو ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی نے شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ متعدد تبصرے شائع ہوئے اور میری متوازن تحریر کی مبصرین نے داد تحسین دی۔ یہ کتاب میرے شائع شدہ متعدد مضامین کی کتابی شکل ہے۔ ''آج کل'' میں شائع ہونے والے مضمون ''علی جواد زیدی کی نظم گوئی'' کو پروفیسر قمر رئیس نے اپنی کتاب ترقی پسند تحریک میں جگہ دی ہے۔

۸۔ رثائیات، شخصیات، تجزیات ۲۰۱۱ء:

میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر سیمیناروں کی ضرورت کے تحت لکھے گئے ہیں اس میں ۷ رثائی مضامین ہیں جس میں ''دبیر کی

شعریات اور ماورائی فضا'' رثائی ادب میں ساختیاتی تنقید کے حوالے سے پہلا مضمون ہے۔ جو ساہتیہ اکادمی دہلی کے دو سو سالہ عالمی انیس و دبیر سیمینار میں پڑھا گیا اور جسے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''انیس و دبیر'' میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''انیس اور زید پور'' کو ڈاکٹر ہلال نقوی (کراچی۔ پاکستان) نے رثائی ادب کے ''یادگار انیس'' نمبر میں شائع کیا ہے۔ ''انیس اور شخصی مرثیہ'' کو رضوی کالج ممبئی کے میر انیس سیمینار میں پیش کیا گیا جس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ اس کے علاوہ ''خیام اور ویدانت'' کو جے این یو کے عالمی سیمینار میں پڑھا گیا جس پر ڈاکٹر کرن سنگھ اور پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مضمون نے خیام پر نئی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''خمریات جوش اور حافظ و خیام'' ایران کلچر ہاؤس دہلی کے سیمینار میں پیش کیا گیا تھا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے اسے بہترین مقالہ قرار دیا تھا۔ بعد میں اسے پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے ''فکر و نظر'' علی گڑھ کے ''فارسی ادب نمبر'' میں شائع کیا۔

۹۔ دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی ۲۰۱۴ء:

نام نیک رفتگاں ضائع مکن۔ کے تحت یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ جس میں زید پور ضلع بارہ بنکی کے ۳۲ مرثیہ گو شعرا کے حالات و کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ حالات و کلام کو پیش کرنے میں ان مرثیہ نگاروں کے مراثی کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے تاکہ قاری ان کے فن سے کما حقہ واقف ہو جائے۔ تذکروں اور ماخذ کے ساتھ ساتھ ذاتی بستوں کی ورق گردانی کر کے بہت سے ایسے مرثیہ نگار بھی سامنے آئے ہیں جو

Scanned with CamScanner

ابھی تک مرثیہ کے محققین کی نظروں سے اوجھل تھے۔

۱۰۔شاگرد دبیر: زکی بلگرامی ۲۰۱۴ء:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے محققین نے عام طور پر چھوٹے شہروں میں رہنے والے اور قصباتی شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے ۔جب کہ بہت سے شعرا اپنے عہد ہی میں شہرت کے بام عروج پر پہنچے لیکن بعد میں وہ گمنامی کے شکار ہو گئے ۔انہیں میں سے ایک اہم شاعر شاگرد دبیر، زکی بلگرامی ہیں ۔اس کتاب میں ان کے حالات وکوائف کے ساتھ ساتھ ان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ نیز ان کے دو غیر مطبوعہ مرثیوں کو بھی شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔

آئندہ شائع ہونے والی کتابیں۔

☆میرے تجزیاتی اوراق : مجموعہ مضامین
☆رثائی تحائف : ترتیب تالیف
☆اردو کے منتخب شخصی مرثیے : ترتیب وانتخاب
☆نوحے کا ارتقائی سفر : تحقیق وتنقید
☆علی جواد زیدی ایک مطالعہ : ترتیب وانتخاب
☆سروش کی رباعیاں : ترتیب وتقدیم

صحافت

☆بطور صحافی پرنٹ میڈیا میں ۱۵ سال کا تجربہ

متعدد روزناموں ہفت روزہ اور ماہناموں میں خبر نویسی اور ادارت کے فرائض انجام دئے جن میں ہفتہ وار وظیفہ لکھنؤ۔ پندرہ روزہ ہماری توحید لکھنؤ، دوماہی العلم ممبئی ہفت روزہ جدید مرکز دہلی۔ممبئی لکھنؤ،

روزنامہ علی الصبح لکھنؤ اور روزنامہ صحافت لکھنؤ میں بحیثیت سب ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر اور نیوز ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔

مضامین :

☆قومی رسالے ۴۰
☆بین الاقوامی رسالے ۱۰
☆کتابوں میں شامل مضامین ۱۰

فیلو شپ:

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے پروجیکٹ ہماری قومی شاعری جلد اول (مصنفہ علی جواد زیدی) کیلئے اکادمی نے راقم کو دو سال کیلئے فیلو شپ دی ۔جس کی وجہ سے ہندوستان کی زیادہ تر لائبریریوں میں مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

سیمینار میں شرکت :

☆قومی ۲۰
☆بین الاقوامی ۸

سیمینار کا انعقاد :

☆تین قومی اور ۵ کالج سطح کے سیمنار منعقد کرائے۔

Scanned with CamScanner

رسائل و جرائد شائع کیے :

☆ایم.جی.ایم کالج سنبھل سے سالانہ میگزین 'سنگم' کا اجرا ۲۰۱۲ء میں کیا۔جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

انعامات و اعزازات:

☆نیشنل اسکالرشپ ایوارڈ ۱۹۹۱۔۱۹۹۰ء

☆اودھ پنچ ایوارڈ ۱۹۹۷ء

☆اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام ۲۰۰۹ء

DR. ABID HUSAIN HAIDARI
HOD Urdu M.G.M. (P.G.) College, Sambhal
Add: ALIYA MENTION, ABBASI TOLA, KOT (W)
Sambhal, 244302 (U.P.) INDIA

Mob: 9411097150 E:mail-drabidhusain@gmail.com

Scanned with CamScanner

DABISTAN-E-ZAIDPUR KI MARSIYA GOI

by

Dr. Abid Husain Haidari

میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر رہا ہوں کہ اس کتاب میں زید پور کے تمام مرثیہ نگار شعرا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے یقیناً بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے یا جن تک میری رسائی نہیں ہوسکی۔ کتاب کی بعض کوتاہیوں سے خود بھی واقف ہوں لیکن آج کی بات کل پر نہیں چھوڑی جاسکتی۔ فرائضِ منصبی اور مکروہاتِ زمانہ سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ابھی بستوں اور بیاضوں پر مزید دیدہ ریزی کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ نظر جہاں بھی میری کم علمی اور کوتاہ نظری کا سراغ لگائیں گے وہاں اس پر بھی نظر رکھیں گے کہ میں نے اردو مرثیہ کے ایک گمنام موضوع پر تقریباً چودہ برس کی خاموش جگر کاری کے بعد تاریخ مرثیہ کی ایک گمشدہ کڑی ڈھونڈ نکالی ہے۔ میری یہ کوشش اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے خشتِ اوّل کا کام کرے گی۔ (ماخوذ پیش گفتار)

SANDESH PARAKASHAN
1955, Gali Nawab Mirza Mohalla Qabristan
Turkman Gate Delhi:110006 (INDIA)
Mob:9313972589, Phone:011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
kitabiduniya@gmail.com

978-93-84270-04-9

Scanned with CamScanner